اللہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (یعنی معرفت حاصل) کریں

لا الہ الا اللہ
محمد رسول اللہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 9

اکابر بالخصوص مجددین رحمۃ اللہ علیہم کی تعلیمات کے تعارف کیلئے

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و خلیفہ مجاز دیگر اکابر رحمۃ اللہ علیہم

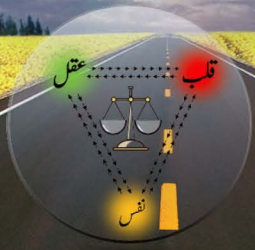

ناشر : خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

حضرت مجدد الف ثانی حضرت کاکا صاحب حضرت شاہ ولی اللہ اور
حضرت شاہ اسماعیل شہید کے علوم شریعت،طریقت اور حقیقت(معرفت) سے
کتابچوں کا سلسلہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر9

(جمادی الاول۔1444ھ) بمطابق (ھجرہ ۔1401 شمسی ہجری)
بمطابق (دسمبر۔ 2022ء)

زیر سرپرستی

حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہٗ العالی

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمَّت کو آجکل کی
سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات

زین العابدین صاحب مدظلہٗ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

مکان نمبر CB-1991/1 ۔بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ گلی
نمبر4 ۔اشرف لین نزد آشیانہ چوک۔اللہ آباد ۔ویسرڈج 3 ۔راولپنڈی

فہرست مضامین

	عنوانات	
1	دیباچہ	2
2	حمد باری تعالیٰ	4
3	نعت رسول اکرم ﷺ	5
4	عارفانہ کلام	7
5	بیان جمعۃ المبارک	8
6	تعلیمات مجددیہ	20
7	مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ	54
7	مختصرات سلوک	77
8	خانقاہ کے شب و روز	80

دیباچہ

الحمد للہ شاہرائے معرفت کا نواں شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور قارئین کے لئے مفید بنائے۔ آمین۔

شمارۂ ہذا کا آغاز "حمدِ باری تعالی اور "نعت شریف" پر مشتمل خوبصورت شعری کلام سے کیا گیا ہے۔

اِس شمارہ میں ایک عارفانہ کلام جبکہ تین نثری مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ایک مقالہ ہے جس میں "نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ" کے مختلف پہلو پر لکھی گئی کتب کے مطالعہ کے حوالے سے راہنمائی کی گئی ہے۔ جبکہ دوسرا مضمون حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کا ایک خطبۂ جمعہ ہے جو حضرت نے خصوصًا "نہی عن المنکر" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔

تیسرا مقالہ مختصرات سلوک میں سے شامل کیا گیا ہے جس میں سلوک طے کرنے کے لیے مجاہدہ کی اہمیت اور اس کی قسموں کے ساتھ ساتھ کچھ مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ ہر شمارہ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے منتخب مکتوب شریف پیش کیا جاتا ہے۔ اِس شمارہ میں عقائد کی اہمیت پر لکھے جانے والے مکتوبات شریفہ میں سے وہ مکتوب گرامی شامل کیا گیا ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد کی تشریح فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں عقیدہ نمبر 19، 20 اور 21 کو شامل کیا گیا ہے جس میں درج ذیل عقائد کی تشریح فرمائی گئی ہے:

» دنیا میں خاص کافروں کو رحمت کا حاصل ہونا ان کے حق میں اِستِدراج اور کیْد (دھوکہ) ہے۔

» کافرِ محض کا نصیب دائمی عذاب ہے۔

» کفر کے علاوہ بعض دوسرے گناہوں کے لئے بھی دوزخ کا عذاب آیا ہے۔ وہ بھی صفاتِ کفر کے شائبہ سے خالی نہیں ہیں، جیسا کہ شرعی اوامر و

نواہی کو بے کار و خوار سمجھنا۔

» اس مکتوب میں ایمان کے کم و زیادہ ہونے کے بارے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اختلاف کو بھی ذکر فرمایا گیا ہے اور نفس ایمان میں کمی و زیادتی کے نہ ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔

» اس مکتوب کے عقیدہ نمبر 20 میں اولیا اللہ کی کرامات کا برحق ہونا بتایا گیا ہے اور فرمایا کہ کرامات کا انکار کرنے والا علم عادی اور ضروری کا انکار کرنے والا ہے۔

» اسی مکتوب کے عقیدہ نمبر 21 میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خلفائے راشدین کے درمیان افضلیت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے اور شیخین کی افضلیت قطعی ہے اور ان کی افضلیت صحابہ اور تابعین کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے سلسلے میں، شمارۂ ہذا میں حضرت حلیم گل بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ" کا درس نمبر 6 پیش کیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا مقالہ چہارم سے کی گئی جس میں اللہ پاک کی معرفت کے بارے میں فرمایا کہ معرفت مومن کی روح کا جوہر ہے۔ جس کسی کو معرفت حاصل نہیں وہ خود موجود نہیں۔ بنانے والے کی پہچان اور معرفت مصنوع سے حاصل ہوتی ہے۔ معرفت میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تمام چیزوں کو محکوم سمجھا جائے اور یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کی ذات و صفات قدیم ہیں۔

اس مقالہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو واضح کیا کہ لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشابہت کسی چیز کے ساتھ نہ کریں، نہ نور سے، نہ ظلمت سے، نہ درخت اور نہ جواہر وغیرہ سے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ شمارۂ ہذا کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی کیفیات و آراء سے مطلع فرمائیں۔ اللہ کریم ہماری کامل اصلاح فرمائے اور ہمیں دائمی رضا سے نوازے۔ آمین۔

حمد باری تعالیٰ

اک لحظہ کی غفلت نہ ہو اس شاہ سے کبھی
شاید اسی لمحے ہو نگاہ تجھ پہ کرم کی

پانے کا، نہ پانے کا تو اختیار نہیں ہے
پس ہم کو چاہئے کہ تگ و دو رہے لگی

محبوب کا جو نام ہے زبان پر کیوں نہ ہو
کس طرح تصور سے رہے دل اس سے خالی

محبوب نے جو کام لگائے ترے ذمے
دل تیرا ان کے واسطے کیوں ہو نہ سلامی

دشمن بہت چالاک ہے تیرا رہ خبردار
ہے دوست بنایا، ترا جو گھر کا ہے بھیدی

تو بھی اس نگہبان کے دامن میں پناہ لے
گردن گرفت سے اس کی نہ باہر ہے کسی کی

دل تیرا در پہ اس کے سجدہ ریز ہو شبیر
مانگو اسی کو اس سے مقام عشق کا ہے یہی

نعت شریف

دور سے قبول ہو سلام میرا یا رسول اللہ
قریب سے کرنے کی میری ہے دعا یا رسول اللہ

آپ کی نظرِ عنایت کا بہت محتاج ہوں
کہ ملے مجھ کو اللہ پاک کی رضا یا رسول اللہ

جل رہا ہے یہ پاکستان آگ میں انتشار کی
بیشک کہ ہے اپنی غفلت کی سزا یا رسول اللہ

آپ کے واسطے اللہ ہم پہ رحم کردے اب
کہ ملے اس سے نکلنے کا سرا یا رسول اللہ

سود کے شر سے خدا ہم کو بچا دے اس ملک میں
ہوا چلے اب معیشت کی صفا یا رسول اللہ

رشوت و جھوٹ نے گندا کیا معاشرہ ہے
حق ہے کہ آوے کا آوا ہے بگڑا یا رسول اللہ

آپ کے طفیل خدا ہم پہ ایسا فضل کرے
کریں گناہ سے اجتماعی توبہ یا رسول اللہ

دندناتے پھرتے اشرار ہیں اس ملک میں ہر طرف
ناک میں دم ہو کے روتے ہیں شرفا یا رسول اللہ

شریر کے شر سے اللہ پاک بچا دے ہم کو
چھوڑی ہے جس نے بالکل شرم و حیا یارسول اللہ

مجھ شبیر کی، در پہ ہو آپ کے حاضری جلدی
بلائے در پہ اپنے میرا نانا یا رسول اللہ

عارفانہ کلام

عشقِ مولا سے تو طاقت لے لے
دلِ بیدار سے بصیرت لے لے

عقل سے خیر و شر سمجھ لینا
نفس کے واسطے تربیت لے لے

تاکہ یہ مانے عقل کی باتیں
اس سے عمل کی تو قوت لے لے

دلِ بیدار کے ذریعے پھر عقل
نفسِ مطمئن سے ہی محنت لے لے

رکاوٹیں نفس کی دور ہوں شبیرؔ
دل پہ احسان کی کیفیت لے لے

بیان جمعۃ المبارک

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
(آل عمران: 104)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

معزز خواتین و حضرات!

اس وقت ہمیں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ در پیش ہے کہ گناہوں میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے، اللہ جل شانہ سے بغاوت کا سماں ہے، اصلاح کی کوششوں پہ پابندی لگ رہی ہے اور گناہوں اور برائیوں کے فروغ کے لئے نئی نئی چیزیں وجود میں آ رہی ہیں۔ ایسے وقت اور ایسے حالات میں ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک دوسرے کو گناہوں سے روکیں۔ ایک دوسرے کو تنبیہ کریں کہ تم کیا کر رہے ہو، آگے چل کر تمہارے ساتھ کیا ہو گا؟

در اصل اس وقت صورتحال یہ ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھا ہوا ہے کہ ہمارے ذمے صرف امر بالمعروف ہی ہے، نہی عن المنکر ہمارے ذمے نہیں ہے۔ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی میں نے جو آیتِ کریمہ تلاوت کی ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ دونوں ضروری ہیں۔ اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: 104)

ترجمہ: "اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں، اور برائی سے روکیں"

چنانچہ اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کا حکم ہے۔ شریعت اوامر و نواہی کا نام ہے۔ اللہ پاک نے کیا کام کرنے کا حکم دیا ہے اور کس چیز سے روکا ہے؟ صرف اوامر پر عمل کرنا مکمل شریعت پر عمل کرنا نہیں ہے بلکہ

یہ تو نصف شریعت ہے۔ جس وقت اوامر کے ساتھ نواہی بھی شامل ہو جاتے ہیں، تب شریعت پوری ہوتی ہے۔ اچھے کام کے لئے کہنا تو ضروری ہے ہی لیکن برائی سے روکنا بھی ضروری ہے۔

میں آپ حضرات سے عرض کرتا ہوں کہ اوامر و نواہی کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ شریعت میں دو بنیادی چیزیں ہیں۔ فرض اور حرام۔ حرام سے بچنا فرض ہے اور فرض کا ترک حرام ہے۔ اگر آپ نے فرض کو ترک کر دیا تو حرام میں مبتلا ہو گئے۔ مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اور نماز نہ پڑھنا حرام ہے۔ اسی طرح سود کھانا حرام ہے تو سود سے بچنا فرض ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل لوگوں نے ان چیزوں کو علیحدہ کر دیا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اس وجہ سے ہمارے اوپر یہ مصیبت آ پڑی ہے کہ عذابات آ رہے ہیں۔ ذرا غور کریں اس وقت ہماری صورتحال یہ ہے کہ ایک کے بعد ایک عذاب آ رہا ہے۔ گرمی اتنی ہوتی ہے کہ اس کی شدت سے لوگ مر رہے ہوتے ہیں۔ یا تو بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگ مر رہے ہوتے ہیں، یا پھر بارش ہوتی ہے تو اتنی شدید ہوتی ہے کہ سیلاب آ جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت ہے۔ ہمیں اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے بچنے کی کوشش اس طرح ہو گی کہ اللہ پاک نے جس چیز کا حکم دیا ہے اس پر عمل کرنا ہے۔

آپ ﷺ نے اِس چیز کو سمجھانے کے لئے ایک مثال دی ہے، کیا شان دار مثال ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ایک بحری جہاز میں کچھ لوگ عرشے پہ بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ چونکہ پانی عرشے کے اوپر پڑا ہے لہٰذا نیچے والے لوگ پانی لینے کے لئے اوپر جاتے ہیں۔ اگر وہ یہ سوچیں کہ ہم خواہ مخواہ لوگوں کو تنگ کرتے ہیں، کیوں نہ اس جہاز کے نچلے حصے میں سوراخ کر لیں۔ سمندر تو ہمارے قریب ہی ہے لہذا پانی ہمارے پاس آ جائے گا، اس طرح ہم اوپر والوں کو تکلیف دینے سے بچ جائیں گے۔ بے شک ان کی نیت اچھی ہو لیکن کام تو غلط ہے۔ ایسی صورت میں اگر عرشے والوں نے ان کو نہ روکا تو صرف نیچے والے نہیں ڈوبیں گے بلکہ سارے کے سارے ڈوبیں گے۔

اسی طرح اگر کھلم کھلا گناہ کرنے والوں کو کوئی بھی نہیں روکے گا تو صرف گناہ کرنے والے تباہ نہیں ہوں گے بلکہ وہ لوگ بھی تباہ ہوں گے جو ان کو روک نہیں رہے۔

میں آپ کو اس کی دوسری مثال دیتا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿١١﴾ إِذِ انۢبَعَثَ أَشْقٰىهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾﴾ (الشمس: 11-15)

ترجمہ: "قومِ ثمود نے اپنی سرکشی سے (پیغمبر کو) جھٹلایا۔ جب ان کا سب سے سنگ دل شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ تو اللہ کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ: خبر دار! اللہ کی اونٹنی کا اور اس کے پانی پینے کا پورا خیال رکھنا۔ پھر بھی انھوں نے پیغمبر کو جھٹلایا، اور اس اونٹنی کو مار ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر سب کو برابر کر دیا۔ اور اللہ کو اس کے کسی برے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے"۔

یہ میں نے سورۂ شمس کے آخری حصہ کی تلاوت کی ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب قومِ ثمود کا ایک شقی اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں اس اونٹنی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اونٹنی اللہ پاک نے غیب سے معجزانہ طور پر اس قوم کو دی تھی۔ وہ بہت بڑی اونٹنی تھی اور بہت سارا پانی پی جاتی تھی۔ جس چشمے سے لوگ پانی پیتے تھے اسی سے وہ اونٹنی بھی پیتی تھی۔ لوگ ڈرتے تھے کہ ہمارا پانی بھی پی جاتی ہے۔ اللہ پاک کی طرف سے حکم آیا کہ ایک دن اونٹنی پانی پیے گی اور ایک دن قوم ثمود کی باری ہو گی۔ کچھ عرصہ اسی حکم پر عمل ہوتا رہا۔ قوم ثمود میں ایک بد معاش تھا جس کا تعلق رنڈیوں کے ساتھ تھا۔ ان رنڈیوں نے اسے کہا کہ اونٹنی ہمارا پانی پی جاتی ہے، اس کو مار دو۔ وہ اونٹنی کو مارنے کے لئے جا رہا تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اسے روکا اور کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور اپنی باری کے دن پانی پیتی ہے اس کو نہ مارو۔ اس نے پیغمبر علیہ السلام کو جھٹلایا اور اس اونٹنی کو مار دیا۔

اب آپ غور کیجئے کہ آگے کیا ہوا۔ چونکہ قوم نے اس شقی کو کچھ نہیں کہا

اسے اس برائی سے روکا نہیں۔ اگر قوم اسے روکتی تو وہ شقی مارا جاتا اور قوم بچ جاتی مگر قوم نے اسے نہیں روکا تو اللہ پاک نے اس پوری قوم کے اوپر اپنا عذاب نازل کیا اور ان کو تہس نہس کر دیا۔ اونٹنی کو قتل کرنے کا گناہ تو شقی کا تھا لیکن پوری قوم کا گناہ یہ تھا کہ وہ اس قتل پر خاموش رہی، اس وجہ سے اللہ پاک نے ان سب کو تہس نہس کر دیا اور اللہ کو کوئی پروا نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔

معلوم ہوا کہ قرآن میں بھی اس کی مثال موجود ہے، حدیث شریف میں بھی اس کی مثال دی گئی ہے۔ اس کے بعد اور کیا چاہیے۔ الحمد للہ ہم مسلمان ہیں، مومن ہیں۔ ہمارے پاس سیکھنے اور سمجھنے کی صرف ایک ہی صورت بن سکتی ہے اور وہ قرآن و حدیث ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، تم اس کا انکار کر سکتے ہو کیونکہ خواب اس کا ہے اور وہ اس پہ حجت ہو سکتا ہے تم پہ نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھے کشف ہوا ہے، آپ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ کشف تجھے ہوا ہے مجھے تو نہیں ہوا۔ لیکن اگر کوئی قرآن سنائے تو تم اس کا انکار نہیں کر سکتے، اگر کوئی حدیث شریف سنائے تو تم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نہ تیرا ہے نہ میرا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ بتانے والا تو بتا رہا ہے کہ اللہ کا کلام یہ کہہ رہا ہے۔ اگر بتانے والا بہت غریب آدمی ہو جس کی کوئی حیثیت نہ ہو تو تم اس وجہ سے اس کی بتائی ہوئی قرآن کی بات کا انکار نہیں کر سکتے۔ اسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیری کیا حیثیت ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کی بات بتا رہا ہے۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے تم اس سے انکار نہیں کر سکتے ہو بے شک تم بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر وہ قرآن کی غلط تشریح کرے، قرآن کی غلط تعلیم کرے پھر تم روک سکتے ہو، بلکہ کوئی ادنیٰ آدمی بھی روک سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ یہ قرآن نہیں ہے۔

الغرض جب قرآن میں اس کی تعلیم آ گئی، حدیث شریف میں اس کی مثال آ گئی تو اس کے بعد ہمارے پاس صرف یہ کام رہ جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھائیں۔

ایک بات اچھی طرح اپنے ذہن میں رکھیں کہ دین میں صرف امر بالمعروف

نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ نہی عن المنکر بھی ہے۔ اگر ہم نہی عن المنکر نہیں کریں گے تو اس کی آفات و بلیّات بھگتیں گے۔

آپ ﷺ نے نہی عن المنکر کے بارے میں کئی ارشادات فرمائے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

"مَنْ رَّأٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ" (صحیح مسلم: 177)

ترجمہ: "تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے پس اسے چاہیے کہ اس برائی کو اپنی قوتِ بازو سے روک دے۔ پس اگر وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے روک دے، پس اگر وہ اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

اس حدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ جو شخص بھی کسی کو کوئی برا کام کرتے دیکھے اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ **"فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ"** اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔ **"فَبِلِسَانِهٖ"** پھر اپنی زبان سے اس کو روک دے۔ جیسے کہ اِس وقت میں زبان استعمال کر رہا ہوں۔ اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو پھر زبان کو استعمال کرنا چاہیے۔ کم از کم زبان سے اس کو کہہ دے کہ بھائی جان! اس طرح نہیں کرنا چاہیے یہ بری بات ہے، اس میں آپ کا نقصان ہے۔ احسن طریقے اور حکمت کے ساتھ **"موعظۃٌحسنہ"** کے انداز میں بتانا چاہیے تاکہ وہ بچ جائے۔ **"فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ"** اگر وہ اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ بعض دفعہ ایسی صورتحال ہوتی ہے کہ کوئی آدمی سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ جیسے ہی آپ نے کسی سے کوئی بات کی، اس نے آپ سے لڑائی کر لی۔ ایسی صورت میں اتنا کافی ہے کہ ہم اپنے دل میں اس چیز کو برا سمجھیں۔ **"وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ"** اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہیں کرتا کہ دل سے بھی اسے برا نہیں سمجھتا، پھر تو اس کے اندر ایمان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم بری چیز کو برا سمجھے۔

میں آپ سے معافی چاہتا ہوں لیکن میں بہت مجبور ہوں، عرض کرنا چاہتا ہوں،

ہمیں پارٹی بازی نے تباہ کر دیا ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اگر میری پارٹی کے لوگ چاہے ننگا ڈانس کروائیں تو وہ غلط نہیں ہے اور دوسری پارٹی اگر تھوڑی سی غلطی بھی کر لے تو وہ غلطی ہے۔ کیا یہ شریعت ہے؟ کیا یہ مسلمانی ہے؟ ہر گز نہیں! خواہ باپ ہو، ماں ہو، بھائی ہو، بیٹا ہو یا کوئی اور ہو، اگر وہ غلط کام کرتا ہے تو وہ غلط ہے۔ جو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے وہ مجرم ہے۔ کم سے کم اس کو مجرم ضرور سمجھنا پڑے گا۔ اگر کوئی یہ بھی نہیں کرتا تو مسلمان کدھر رہا، اس کا ایمان کدھر رہا؟ کم از کم جرم کو جرم سمجھے تو سہی۔

اس وقت صورتحال نازک ہو گئی ہے۔ پارٹی بازی نے ہمیں خراب کر دیا ہے۔ سیاست اپنی جگہ پر ہے، ہم لوگ سیاست کے مخالف نہیں ہیں۔ سیاست اچھائی کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہے برائی کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سیاست جس میں ہماری پارٹی کی ہر بات ٹھیک اور دوسری پارٹی کی ہر بات غلط ہو، وہ صحیح سیاست نہیں ہے۔ وہ شیطانی سیاست ہے۔ ایسی سیاست سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ ہم لوگ حق کو حق کہیں چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو اور باطل کو باطل کہیں چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو۔ اپنی طرف سے اپنی خواہش کو اس میں نہ لائیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَا مِنْ رَّجُلٍ يَّكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَّعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ فَلَا يُغَيِّرُوْا إِلَّا أَصَابَهُمُ اللهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتُوْا" (سنن ابی داؤد: 4339)

ترجمہ: "اگر کوئی شخص کسی قوم میں گناہ کرتا ہو اور وہ لوگ اسے روکنے کی طاقت کے با وجود نہ روکیں تو پھر اللہ ان کے مرنے سے پہلے انہیں اپنے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کی قوم میں برائی ہو رہی ہو، گناہ کے کام ہو رہے ہوں اور وہ آدمی اس پر طاقت رکھتا ہو کہ اس کو روک دے، اس کو تبدیل کر دے پھر بھی وہ اس کی روک تھام نہ کرے تو موت سے پہلے پہلے اس کی سزا اس کے اوپر آ پڑے گی۔

اس وقت صورتحال یہی ہے کہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی با وجود قدرت کے برائی کی روک تھام نہیں کرتا۔ مثلاً میں افسر ہوں اور دفتر میں اپنے ما تحتوں کو روک سکتا ہوں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں لیکن دفتر میں افسر ضرور ہوں کم از کم دفتر میں اپنے ما تحتوں کو تو برائی سے روک ہی سکتا ہوں۔ میں گھر میں باپ ہوں یا شوہر ہوں تو اپنی اولاد کو اور اپنی بیوی کو تو روک ہی سکتا ہوں۔ میں محلے میں بڑا ہوں، لوگ میری عزت کرتے ہیں تو میں اپنی عزت کو استعمال کر کے لوگوں کو اچھی بات کہہ تو سکتا ہوں۔ میں سکول میں استاذ ہوں تو کم سے کم اپنے شاگردوں کو خیر کی تعلیم تو کر سکتا ہوں، برائی سے تو روک ہی سکتا ہوں۔ جو کرنے والے لوگ ہوتے ہیں وہ ایسا کر کے دکھا دیتے ہیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی درجے میں قدرت ضرور رکھتا ہے۔ حدیث میں ہے:

ترجمہ: "ہر آدمی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا۔ امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ مرد اپنے گھر کے معاملات کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہو گا"۔ (صحیح بخاری: 2558)

نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق تم سب نگران ہو اور ہر ایک سے پوچھا جائے گا۔ تم اپنے اپنے شعبے کے نگران ہو اور تم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

لہذا ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داری محسوس کرے کہ میں اس وقت کس چیز کا ذمہ دار ہوں اور کہیں میری ذمہ داری میں گڑبڑ تو نہیں ہو رہی۔ اگر گڑ بڑ ہو رہی ہے تو میں اس کا مداوا کر لوں، اس کے لئے کچھ منصوبہ بندی کر لوں۔

ایک بات عرض کرتا ہوں کہ آج کل مسلمانوں کے اندر ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان خیر کے کاموں میں منصوبہ بندی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں بس دیکھا جائے گا۔ خدا کے بندو! یہ کیا بات ہے۔ ذرا جائزہ لے کر دیکھو کہ باہر کیا ہو

رہا ہے۔ باہر ہر چیز کے لئے پچاس پچاس سال پہلے کی پلاننگ ہوتی ہے، اس کے اوپر عمل کیا جاتا ہے اور اس کے مطابق نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، ہم تو اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ ہم پلاننگ کریں کیونکہ ہمیں قرآن اور حدیث کی رہنمائی بھی حاصل ہے، ان کو یہ رہنمائی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے مطابق planning (پلاننگ) کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف پلاننگ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کام کے اندر جتنے لوگ شامل ہیں آپس میں coordination کر لیں۔ مثلاً آپ استاذ ہیں اور آپ نے سکول میں شاگردوں کو بہترین اخلاق دینا ہے تو اسکول کے اندر تمام اساتذہ آپس میں coordinate (موافقت) کر لیں اور باقی سکولوں کے اساتذہ کو بھی اس کارِ خیر میں شامل کر لیں کہ وہ آپ کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں اور آپ ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ ایک آدمی سارا کام نہیں کر سکتا۔

اسی طرح معاشرے میں جتنے لوگ اچھے کام کرنا چاہتے ہیں اور الحمد للہ ایسے لوگ ہیں، ان سب کو آپس میں coordinate کرنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں ہوا کرتا۔ جذباتی انداز میں کام نہیں ہوتے کہ میں جذباتی طور پر نعرے بازی شروع کر لوں۔ نعرے بازی سے کام نہیں ہوتے نعرے بازی سے صرف خون گرم کیا جاتا ہے۔ گرم خون کو راستہ بھی تو دینا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کافر کو نیچے گرا دیا اور اسے کہنے لگا کلمہ پڑھو ورنہ چھوڑوں گا نہیں۔ وہ ڈر گیا اور کہا: اچھا ٹھیک ہے کلمہ پڑھا دو۔ پہلا کہنے لگا کہ اوہ وہ تو مجھے بھی نہیں آتا۔ خدا کے بندو! اپنا کام تو سیکھو۔ یہ تو سمجھو کہ تم کسی کو کیا دینا چاہتے ہو۔ کیا بتانا چاہتے ہو۔ اس کے لئے محنت کرنی چاہیے، غور و فکر کرنا چاہیے، آپس میں مشورے کرنے چاہئیں۔ قرآن پاک کے مطابق ان مشوروں میں خیر ہوتی ہے جو خیر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا آپس میں مشورے ہونے چاہئیں، آپس میں coordination ہونی چاہیے، procedure develop ہونے چاہئیں۔ پھر ان کو چیک کرنا چاہیے کہ ان سے کتنا فائدہ ہو رہا ہے اور کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ نقصان کو کم کرنا چاہیے اور فائدے کو زیادہ کرنا چاہیے یہ ایک طریقۂ کار ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حدیث شریف کے مطابق برائی کو دیکھ کر خاموش رہنے والوں پر بھی عذاب آ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بہت اہم ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"إِذَا عُمِلَتِ الْخَطِيئَةُ فِي الْأَرْضِ كَانَ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا كَمَنْ غَابَ عَنْهَا وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا" (سنن ابی داؤد: 4345)

ترجمہ: "جب زمین پر گناہ کے کام کئے جاتے ہوں تو جو شخص وہاں حاضر رہا اور اسے ناپسند کیا یا برا جانا اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جس نے اسے دیکھا ہی نہ ہو، اور جو شخص وہاں حاضر نہ تھا لیکن اسے پسند کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو وہاں حاضر تھا"۔

یعنی جب زمین پر کوئی غلط کام ہو رہا ہو اور ایک شخص وہاں موجود ہے لیکن اس برائی کو دل سے برا سمجھ رہا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے ادھر نہیں ہے۔ مثلاً کراچی میں کوئی غلط کام ہو رہا ہے اور کراچی والے اس کو نہیں چاہتے اس سے نفرت کرتے ہیں کہ یہ تو غلط کام ہے تو وہ اس کام میں شامل نہیں ہوں گے۔ جبکہ پشاور میں ایک شخص ہے جو اس کام کو چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے تو وہ اس برائی میں شامل ہے۔ اسی طرح اگر پشاور میں کوئی غلط کام ہو رہا ہو اور لاہور والا اسے برا نہ سمجھتا ہو تو وہ اس برائی کے کرنے والوں میں شامل ہے۔

اس وجہ سے ہم لوگوں کو اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ ہم کس کے ساتھ ہیں اور کس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اس سلسلے میں ہم لوگوں کو دیکھنا پڑے گا کہ ہماری ترجیحات کیا ہیں۔ اس سلسلے میں آخری حدیث شریف عرض کرنا چاہتا ہوں، میں تو یہ پڑھ کر ڈر جاتا ہوں۔ اللہ پاک معاف فرمائے۔

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوْحَى اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِأَهْلِهَا قَالَ: يَا رَبِّ إِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔ قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ" (مشکوۃ المصابیح: 5152)

أَوْحَى اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام

کو وحی فرمائی۔ **أَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِأَهْلِهَا**: اس شہر کو الٹا کر دو ان لوگوں کے اوپر۔ **قَالَ**: اس نے عرض کیا۔ **يَا رَبِّ**: اے میرے رب۔ **إِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا**: اس میں تو ایک ایسا نیک بندہ ہے۔ **لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ**: اس نے ایک لمحے کے لئے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ **فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ**: اس کے اوپر بھی الٹا کر دو اور ان لوگوں کے اوپر بھی الٹا کر دو۔ **فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ**: اس شخص کی برائی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھی اس کا چہرہ متغیر نہیں ہوا، ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے پہ اثر نہیں آیا کہ کوئی برا کام ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی دل سے میرے ساتھ نہیں تھا، نمازیں پڑھ رہا ہے، روزے رکھ رہا ہے، زکوۃ دے رہا ہے، حج کر رہا ہے، دوسرے نیک کاموں میں لگا ہوا ہے۔ بلا شبہ وہ اچھے کام ہیں لیکن برائی کو برائی سمجھنا بھی اچھا کام ہے وہ کام یہ نہیں کر رہا۔ لہٰذا اس کے اوپر بھی بستی کو الٹا کر دو۔

اب بتائیں اور کیا کہنا چاہیے، کیا اور کوئی بات رہ گئی؟ ان سب باتوں کے مدِ نظر ہمیں خود کو اس آئینہ میں دیکھنا چاہیے کہ اس وقت صورتحال کیا ہے، ہم کس چیز کو دیکھ رہے ہیں، کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا۔ کیا ہم اسی طرح خاموش بیٹھے رہیں؟ کیا ہم اپنا اپنا رسوخ استعمال نہ کریں؟ کیا اپنی دوستی استعمال نہ کریں؟ کیا اپنا قلم استعمال نہ کریں؟ کیا اپنی زبان استعمال نہ کریں؟ اگر ہم میں کوئی طاقت ہے تو کیا وہ طاقت استعمال نہ کریں؟ ہم لوگوں کو اس کی فکر کرنی پڑے گی۔ ایک دن آنے والا ہے جب سب کو اپنا اپنا حساب دینا پڑے گا۔ ایسی صورت میں مجھے ابھی سے اس کی تیاری کرنی پڑے گی، مجھے ابھی سے اس کی فکر کرنی پڑے گی۔ اللہ ہم سب کو وہاں کے خراب انجام سے بچائے۔ ابھی بیان سے پہلے یہاں کسی کے فوت ہونے کا اعلان ہوا تھا، اللہ ان کی مغرت فرمائے۔ ہم سب نے ایک دن جانا ہے۔ یہ دن سب پہ آنے والا ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو سمجھو کہ میں جا رہا ہوں۔

ایک بزرگ راستے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جنازہ آیا۔ کسی نے پوچھا یہ جنازہ کس کا ہے؟ اس بزرگ نے کہا تیرا ہے۔ وہ آدمی یہ سن کر غصے میں آ گیا۔ بزرگ نے فرمایا: اگر ناراض ہوتے ہو تو سمجھ لو کہ یہ میرا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ

اس بات کی کیا فکر کہ کس کا جنازہ ہے، یہ دیکھو کہ یہ تیرے ساتھ بھی ہونے والا ہے۔ تجھے بھی یہی حالت پیش آنے والی ہے۔ لہذا موت سے پہلے پہلے موت کی تیاری کرنا ضروری اور لازم ہے۔ بھائی! جو اچھی حالت میں چلا گیا وہ خوش نصیب ہے۔ اللہ اسے وہاں بہتر درجات نصیب فرمائے اور خدانخواستہ اگر کوئی برے انجام کے ساتھ چلا گیا تو بہت خطرناک بات ہے۔ کیونکہ پھر واپس آنا نہیں ہے۔

میں آپ کو ایک اپنی ذاتی بات بتانا چاہتا ہوں۔ یقین جانیں اگر اولیاء اللہ فوت ہو جائیں تو مجھے غم نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو اپنے اللہ کے پاس چلے گئے اور ان کے مزے کے دن شروع ہو گئے۔ البتہ ہم محروم ہو گئے، یہ ہمارے لئے ضرور محرومی کی بات ہے لیکن ان کے تو مزے کے دن شروع ہو گئے لیکن جب کوئی فاسق و فاجر فوت ہو جائے تو مجھے بڑی پریشانی اور بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ اس کا معاملہ اب ختم ہو گیا اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی کے لئے جو وقت تھا وہ ختم ہو گیا، جو موقع دیا گیا تھا وہ ختم ہو گیا، اب یہ کیا کر سکتا ہے۔ یہ واقعی ڈرنے کی بات ہے۔ لہٰذا ہمیں موت سے پہلے پہلے موت کی تیاری کر لینی چاہیے۔

"مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" "مر جاؤ اس سے پہلے کہ مر جاؤ"۔ کیونکہ موت تو سب کو آنی ہے۔ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو یقین نہ ہو کہ میں مروں گا۔ اگر دنیا میں کوئی ایسا شخص ہو گا تو وہ پاگل ہی ہو گا۔ ایسا آدمی صحیح دماغ والا نہیں ہو سکتا۔ سب شعور والے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہم ایک دن ضرور مریں گے۔ البتہ مرنے کے بعد کیا ہو گا اس پہ اختلاف ہے، مومن کی سوچ الگ ہے کافر کی سوچ الگ ہے۔ مومن کہتا ہے حساب کتاب ہو گا سب کچھ ہو گا لہٰذا ہم لوگوں کو اس حساب کتاب کے لئے تیار رہنا چاہیے اور اس کے لئے طریقہ کار یہ ہے کہ شریعت پر عمل کیا جائے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ پورے کا پورا دین صحیح سالم موجود ہے۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: 3)

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت

پوری کر دی، اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لئے) پسند کر لیا"۔

ہم بہت خوش نصیب ہیں۔ اتنے خوش نصیب کہ ہمارے لئے پوری کی پوری رہنمائی موجود ہے، بس صرف کام لینے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

تعلیمات مجددیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
اَمَّا بَعْدُ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گذشتہ درس میں عقیدہ نمبر 19 کا بیان چل رہا تھا، آج ہم اسی کو آگے بڑھائیں گے۔

متن:

سوال:

اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں کافروں کو رحمت سے حصہ حاصل ہے، جیسا کہ تو نے مندرجہ بالا عبارت میں تحقیق کی ہے تو پھر دنیا میں رحمت کی صفت نے ذاتی عداوت کو کیسے دور کر دیا؟

جواب:

میں کہتا ہوں کہ دنیا میں خاص کافروں کو رحمت کا حاصل ہونا ظاہری طور پر اور صورت کے اعتبار سے ہے لیکن حقیقت میں وہ ان کے حق میں اِستِدراج اور کیْد (دھوکہ) ہے، ان کے حق میں آیتِ کریمہ:

﴿اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمْ بِہٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ ۙ نُسَارِعُ لَھُمْ فِی الْخَیْرٰتِ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ﴾ (المومنون: 55-56)

ترجمہ: "کیا یہ لوگ اس خیال میں ہیں کہ ہم ان کو جو دولت اور اولاد دیے جارہے ہیں۔ تو ان کو بھلائیاں پہنچانے میں جلدی دکھا رہے ہیں؟ نہیں، بلکہ ان کو حقیقت کا شعور نہیں ہے"۔

اور آیتِ کریمہ:

﴿سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾

(الاعراف: 182-183)

ترجمہ: "اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے انھیں ہم اس طرح دھیرے دھیرے پکڑ میں لیں گے کہ انھیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں، یقین جانو کہ میری خفیہ تدبیر بڑی مضبوط ہے"۔

ان ہی معنٰی پر شاہد ہیں۔ پس سمجھ لو۔

فائدہ جلیلہ:

دوزخ کا دائمی عذاب کفر کی جزا (بدلہ) ہے اور بس۔ اگر پوچھیں کہ ایک شخص ایمان کے با وجود کفر کی رسمیں بجا لاتا اور اہلِ کفر کی رسموں کی تعظیم کرتا ہے، اور علماء اس پر کفر کا حکم لگاتے ہیں اور مرتد سمجھتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان اس بلا میں مبتلا ہیں۔ لہذا چاہیے کہ علماء کے فتوے کے بموجب وہ شخص آخرت کے ابدی عذاب میں گرفتار ہو، حالانکہ اخبارِ صحاح (صحیح احادیث) میں آ چکا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا اللہ تعالٰی اس کو دوزخ سے باہر نکال لیں گے اور دائمی عذاب میں نہ رہنے دیں گے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی کیا تحقیق ہے؟

جواب:

میں کہتا ہوں اگر وہ شخص کافر محض ہے تو دائمی عذاب اس کا نصیب ہے، **عِیَاذًا بِاللّٰہِ سُبْحَانَہٗ مِنْہُ** (اللہ سبحانہ کی اس سے پناہ) اور اگر کفر کی رسومات بجا لانے کے با وجود ذرہ برابر ایمان بھی رکھتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب میں مبتلا تو ہو گا لیکن اس ذرہ برابر ایمان کی برکت سے امید ہے کہ ابدی عذاب سے خلاصی ہو جائے گی اور دائمی گرفتاری سے نجات پا لے گا۔

فقیر ایک مرتبہ ایک شخص کی مزاج پرسی کے لئے گیا جس کا معاملہ نزع و موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب فقیر اس کے حال پر متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کا قلب "ظلماتِ بسیار" (بہت زیادہ ظلمتوں) میں گھرا ہوا ہے، ہر چند ان ظلمتوں کے دور کرنے میں متوجہ ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، پھر بہت زیادہ توجہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ظلمات و تاریکیاں "صفاتِ کفر" کی وجہ سے پیدا ہوئی

ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں اور یہ کدورتیں اس کے کفر اور اہلِ کفر کے ساتھ دوستی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں، اور توجہ کرنے سے یہ ظلمتیں دور نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان ظلمات کا تنقیہ دوزخ کے عذاب پر وابستہ ہے جو کفر کی جزا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ذرہ برابر ایمان بھی رکھتا ہے جس کی برکت سے آخر کار اس کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا، اور جب اس کے حال کا مشاہدہ کر لیا تو اب دل میں آیا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ توجہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز جنازہ ادا کرنی چاہیے۔ لہذا وہ مسلمان جو ایمان کے با وجود اہلِ کفر کی رسومات بجا لاتے ہیں اور (ہنود کے) تہواروں کے ایام کی تعظیم کرتے ہیں، ان کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیے اور ان کو کفار کے ساتھ نہیں ملا دینا چاہیے جیسا کہ آج کل علماء کا معمول ہے، اور امید وار رہنا چاہیے کہ آخر کار ایمان کی برکت کی وجہ سے دائمی عذاب سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

پس معلوم ہوا کہ اہل کفر کے لئے عفو اور مغفرت نہیں ہے۔ آیتِ کریمہ:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ ﴾ (النساء: 48)

ترجمہ: "بیشک اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے"۔

اور اگر وہ محض کافر ہے تو "عذابِ ابدی" اس کے کفر کی جزا ہے۔ اور اگر ذرہ برابر بھی ایمان رکھتا ہے تو اس کی جزا "**عذابِ مُوَقَّت**" (وقتی عذاب) ہے اور باقی تمام کبیرہ گناہوں کو اگر حق سبحانہ و تعالیٰ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔ فقیر کے نزدیک "عذابِ دوزخ" خواہ وقتی ہو یا دائمی، کفر اور صفاتِ کفر کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ آگے تحقیق سے معلوم ہو گا۔ اور کبیرہ گناہ والے جن کے گناہ توبہ، شفاعت، یا صرف عفو و احسان کے ساتھ مغفرت کے قابل نہیں ہوتے، یا جن کبیرہ گناہوں کا کفارہ دنیاوی تکالیف یا سختیوں اور سکرات موت سے نہیں ہوا، امید ہے کہ ایسے لوگوں میں سے بعض کو قبر کا عذاب کفایت کرے گا اور بعض کے لئے قبر کی سختی کے با وجود قیامت کا خوف اور اس دن کی تکالیف کافی ہوں گی اور ان کے گناہوں میں سے کوئی گناہ باقی نہیں چھوڑیں گے جس کی وجہ

سے دوزخ کے عذاب کے مستحق ہوں۔ چنانچہ آیتِ کریمہ:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ﴾ (الانعام: 82)

ترجمہ: "(حقیقت تو یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کا شائبہ بھی آنے نہیں دیا امن اور چین تو بس انہی کا حق ہے"۔

اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ **واللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ بِحَقَایِقِ الْاُمُوْرِ کُلِّهَا** (اور اللہ سبحانہ ہی تمام امور کے حقائق کو بہتر جانتا ہے)۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کفر کے علاوہ بعض گناہوں کی سزا بھی عذاب دوزخ آئی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا﴾ (النساء: 93)

ترجمہ: "اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا"۔

(جو شخص کسی مومن کو قصداً قتل کرے پس اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اخبار (احادیث شریفہ) میں ہے کہ جو شخص قصداً ایک نماز فرض قضا کرے تو اس کو ایک حقبہ (یعنی اسّی سال) دوزخ میں عذاب دیا جائے گا۔ لہذا دوزخ کا عذاب صرف کافروں کے لئے ہی مخصوص نہ رہا (اور تم کہتے ہو کہ دوزخ کا عذاب کافروں کے لئے ہی مخصوص ہے)۔

(جواب میں) میں کہتا ہوں کہ یہ عذاب اس قاتل کے لئے مخصوص ہے جو قتل کو حلال جانے کیونکہ قتل کو حلال جاننے والا کافر ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے۔ اور کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں کے لئے بھی دوزخ کا عذاب آیا ہے۔

تشریح:

عذاب کی دو قسمیں ہیں: (1) لامتناہی عذاب (کبھی نہ ختم ہونے والا)۔

(2) محدود عذاب (کچھ عرصہ کے لئے)۔

لا متناہی عذاب کفار و مشرکین کے ساتھ مختص ہے جبکہ محدود عذاب فاسق و فاجر مسلمانوں کے لئے ہے جو انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے دیا جائے گا۔

جن چیزوں پر ایمان لانا لازم ہے، ان پر ایمان نہ لانا یا ان کا انکار کرنا کفر ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ضروریاتِ دین یا لوازماتِ ایمان کا انکار کرنا کفر ہے۔ کافر ہونے کے لئے تمام چیزوں کا انکار کرنا ضروری نہیں ہے، کسی ایک کو نہ ماننے سے بھی کفر کا ارتکاب ہی سمجھا جاتا ہے۔

مثلاً تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت پہ ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی ایک نبی کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ تمام فرشتوں پہ ایمان لانا ضروری ہے کسی ایک فرشتے کا انکار کرنا بھی کفر کا موجب ہے۔

قرآن پاک پر اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہونے کی حیثیت سے ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی سارے قرآن پر ایمان رکھتا ہو مگر صرف کسی ایک آیت کا انکار کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر کے لئے ضروری نہیں ہے کہ تمام چیزوں کا انکار کیا جائے بلکہ کسی ایک چیز پر ایمان نہ رکھنے سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

شریعتِ مطہرہ نے قتلِ ناحق کو حرام قرار دیا ہے۔ جو آدمی قتلِ ناحق کو حلال جانے وہ کافر ہو جائے گا۔

اسی طرح کفر کی کسی بات کو پسند کرنا بھی کفر ہے۔

بہرحال کفر پر جو عذاب ہو گا وہ لا متناہی عذاب ہو گا، جو کبھی ختم نہ ہو گا اور جو عذاب ایمان کے ہوتے ہوئے گناہ کرنے کی سزا کے طور پہ ہو گا وہ محدود عذاب ہو گا۔ ممکن ہے کہ اللہ پاک اپنے فضل سے کسی کے وہ گناہ معاف فرما دیں اور بغیر سزا دیئے جنت میں بھیج دیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ان گناہوں کی سزا کے طور پر محدود عذاب میں رکھا جائے اور سزا پوری ہونے کے بعد جنت بھیج دیا جائے۔

اگر ایمان باقی ہو تو توبہ کے ذریعے گناہ معاف ہو جاتے ہیں چاہے سمندروں کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، لہٰذا توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ جس وقت کسی

چیز کی فضیلت سنی جائے تو حتی الامکان اس پہ فوراً عمل کیا جائے، ایسا کرنے سے اس عمل کا نور نصیب ہو جاتا ہے۔ آئیے ہم سب توبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کی توبہ قبول فرمائے۔ اے اللہ تعالیٰ! ہم توبہ کرتے ہیں تمام گناہوں سے، چھوٹے گناہوں سے بھی، بڑے گناہوں سے بھی، جو ہمیں معلوم ہیں ان سے بھی اور جو ہمیں معلوم نہیں ہیں ان سے بھی، جو قصداً ہوئے ہیں ان سے بھی اور جو خطاءً ہوئے ہیں ان سے بھی، ظاہر و باطن کے سارے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ یا اللہ ہماری توبہ قبول فرما لے۔

متن:

اور کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں کے لئے بھی دوزخ کا عذاب آیا ہے۔ وہ بھی صفاتِ کفر کے شائبہ سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ اس گناہ کو معمولی سمجھنا اور اس کے ارتکاب کے وقت بے پروائی کرنا اور شرعی اوامر و نواہی کو بے کار و خوار سمجھنا وغیرہ وغیرہ اور خبر (حدیث) میں ہے:

"شَفَاعَتِيْ لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِيْ" (سنن ترمذی: 2435)

ترجمہ: "میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہو گی"۔

اور دوسری جگہ فرمایا ہے کہ:

"أُمَّتِيْ أُمَّةٌ مَّرْحُوْمَةٌ لَّا عَذَابَ لَهَا فِي الْآخِرَةِ" (سنن ابی داؤد: 4278)

ترجمہ: "میری امت، امت مرحومہ (رحم کی ہوئی) ہے اس کے لئے آخرت میں عذاب نہیں ہے"۔

اور آیتِ کریمہ:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ﴾ (الانعام: 82)

ترجمہ: "(حقیقت تو یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کا شائبہ بھی آنے نہیں دیا امن اور چین تو بس انہی کا حق ہے"۔

بھی اس معنی کی تائید کرتی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

اور مشرکوں کے بچوں کے احوال، اور پہاڑوں پر رہنے والے، اور پیغمبروں کے زمانۂ فترت کے مشرکوں کا حال، اس مکتوب (دفتر اوّل مکتوب 259) میں جو فرزندی محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر ہوا ہے، مفصل مذکور ہو چکا ہے وہاں ملاحظہ کر لیں۔

اور ایمان کے کم و زیادہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اعظم کوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "**اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ**" (ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم)۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "**اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ**" (ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے) اور اس میں شک نہیں کہ ایمان سے مراد تصدیق اور یقین قلبی ہے جس میں زیادتی و کمی کی گنجائش نہیں، لہذا جو ایمان کہ کمی و زیادتی کو تسلیم کرے وہ دائرۂ ظن میں داخل ہے نہ کہ یقین کے درجہ میں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اعمال صالحہ کا بجا لانا اس یقین کو جِلا دیتا ہے اور غیر صالح اعمال کا بجا لانا یقین کو مکدّر کر دیتا ہے۔ لہذا (ایمان کی) کمی و زیادتی اعمال کے اعتبار سے اس یقین کو روشن و جِلا کرنے میں ثابت ہوئی نہ کہ نفس یقین میں۔

تشریح:

ایمان کا تعلق ماننے سے ہے۔ اس کی مثال آئین کی سی ہے۔ جو آئین کو نہیں مانتا وہ باغی ہے۔ ہاں اگر آئین میں مذکور کسی چیز پہ عمل نہیں کرتا تو باغی نہیں ہو گا لیکن مجرم ضرور ہو گا۔ اسی طرح جو بالکل ایمان ہی نہ رکھے، وہ تو باغی ہے اور جو دل میں ایمان رکھتا ہو مگر عمل نہ کرتا ہو وہ بد عمل ضرور ہے مگر کافر نہیں۔

در اصل ایمان بنیاد ہے۔ جسے یہ بنیاد حاصل ہو وہ کوئی بھی نیک عمل کرے گا، ایمان کی وجہ سے وہ عمل فائدہ دے گا اور اعمال نامہ میں نیک اعمال میں اضافہ کرے گا۔ اور جسے یہ بنیاد ہی حاصل نہ ہو وہ چاہے ساری زندگی نیک اعمال کر لے اس کا اعمال نامہ آخرت کے لحاظ سے خالی ہی رہے گا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایمان 1 ہے اور کفر 0 ہے۔ جسے 1 حاصل ہے اس کا ہر نیک عمل اس ایک میں جمع ہوتا جائے گا اور اس کے 1 کی مقدار بڑھتی چلی جائے گی اور جسے یہ 1 حاصل نہیں، وہ چاہے ہزاروں نیک اعمال کر لے وہ سب 0 (صفر) کے ساتھ ہی ضرب دیئے جائیں گے اور زیرو میں کتنے ہی کروڑ کیوں نہ ضرب کر لئے جائیں حاصل ضرب

0 ہی رہتا ہے۔

میں اپنے طلباء کو سمجھانے کے لئے اکثر یہ فارمولا بتایا کرتا تھا

$$(Q = K(\alpha\beta\gamma\delta$$

لہٰذا۔ الفا (α)، بیٹا (β)، گیما (γ) اور ڈیلٹا (δ)

یہ سب ایمانیات ہیں۔ ہر چیز پر الگ الگ ایمان لانا ضروری ہے۔ ان سے کوئی Alpha ہے، کوئی Gamma ہے، کوئی Beta ہے اور کوئی Delta ہے۔ مثلاً اللہ پر ایمان Beta، رسولوں پر ایمان Gamma اور کتابوں پر ایمان Delta ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی ایمان نہ رہا تو کفر لازم آ گیا، کسی ایک کی ویلیو بھی زیرو ہو گئی تو سب ختم ہو گیا۔ اگر سب کی ویلیو 1 ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اسی طرح اگر سب ایمانیات پر پورا پورا ایمان ہے تو تب ہی ایمان قائم رہے گا۔ اگر کسی ایک چیز پر بھی ایمان نہ رہا تو کسی چیز پر ایمان کا رکھنا فائدہ نہ دے گا بلکہ کفر لازم آئے گا۔

اسی وجہ سے احناف کہتے ہیں کہ "**اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ**" (ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی کم ہوتا ہے)۔ جو حضرات ایمان میں کمی زیادتی کے قائل ہیں در اصل انہوں نے ایمان کے ساتھ کیفیتِ ایمان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ کیفیتِ ایمان کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا دار و مدار اعمال پر ہے۔ لیکن امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے کہ ایمان میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔ کمی زیادتی کیفیت میں ہوتی ہے اور یہ کیفیت ہوتی تو ایمان کی ہے لیکن یہ خود ایمان کا جز نہیں ہوتی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بہت گہری ہوتی ہے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ایسے وقت میں کام آتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

جب میں شفقِ احمر و ابیض پہ کام کر رہا تھا تو یہ بات سامنے آئی کہ شفقِ ابیض کے غائب ہونے کا ایک مخصوص پیمانہ ہے کہ یہ ہمیشہ 18 ڈگری پر ہی غائب ہوتا ہے لہٰذا موسم کیسا بھی ہو، بادلوں کی وجہ سے شفق ابیض نظر نہ بھی آئے تب بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ 18 ڈگری پر شفقِ ابیض غائب ہو گیا ہے۔

در اصل شفقِ ابیض سات روشنیوں سے بنتا ہے۔ لہٰذا اس پہ موسم اثر انداز نہیں ہوتا۔ درجہ حرارت، آب و ہوا کی نمی اور گرد و غبار، ان تمام عناصر کی وجہ سے شفق ابیض مدھم تو ہو سکتا ہے لیکن مکمل طور پر غائب نہیں ہوتا، فضا میں موجود رہتا ہے جبکہ شفقِ احمر پہ موسم اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر humidity (فضا میں نمی) ہو تو شفق احمر زیادہ دیر تک رہے گا اور اگر humidity (نمی) نہ ہو، موسم خشک ہو تو شفق احمر جلدی ختم ہو جائے گا۔

اس تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ شفق احمر کے غائب ہونے کا تعلق ڈگری کے ساتھ ہے وقت کے ساتھ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ آج ساڑھے بارہ ڈگری پہ غائب ہو اور کل ساڑھے 14 پہ غائب ہو جائے، اس سے اگلے دن 15 پہ غائب ہو جائے اور اس سے اگلے دن 13 پہ غائب ہو جائے۔ ڈگری ہر دن الگ الگ ہو سکتی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق شفق ابیض کا حساب ممکن ہے، موسم کیسا بھی ہو مخصوص طریقے سے حساب لگا کر شفق ابیض کو معلوم کیا جا سکتا ہے جبکہ شفق احمر کا حساب ممکن نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق با قاعدہ مشاہدہ کے ساتھ ہے۔ لہٰذا یا تو مشاہدہ کیا جائے یا پھر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پہ عمل کرتے ہوئے شفق ابیض کو سامنے رکھا جائے۔

شفقِ احمر کا مشاہدہ آسان ہے کیونکہ یہ روشنی میں بھی نظر آ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک رنگ ہے اور رنگ والی چیز کا مشاہدہ آسان ہے لیکن آج کل کوئی مشاہدہ نہیں کرتا۔ مجھ سے اکثر علمائے کرام پوچھتے ہیں کہ شفقِ احمر کی کیا ڈگری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اس کی متعین ڈگری کیا ہے، کیونکہ میں نے ساڑھے 12 ڈگری سے لے کے ساڑھے 14 ڈگری تک مختلف اوقات میں اس کا مشاہدہ کیا ہے لہٰذا کسی ایک مخصوص ڈگری کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ جس نے شفقِ احمر پہ عمل کرنا ہو اسے مشاہدہ سے کام لینا ہو گا اور جس نے مخصوص معیار کو سامنے رکھنا ہے وہ شفقِ ابیض والے مسلک پہ عمل کر لے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے شفقِ ابیض کو ہی اختیار کیا ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ موسم

کوئی بھی ہو، مطلع کی صورت حال کیسی ہی ہو، شفقِ ابیض کا علم ہر حال میں ہو ہی جاتا ہے۔

اس مسئلہ پر جن حضرات نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اختلاف کیا تھا ان میں سے بعض نے یہ فرمایا کہ ہم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس لئے اختلاف کر رہے ہیں کہ ہم ان کی بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ پا رہے۔ اگر گہرائی تک پہنچ جائیں تو اختلاف نہیں رہے گا۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ شام کے علاقے میں گئے اور اپنے ایک محدث استاذ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ استاذ نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں کوفہ سے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ بتائیں کہ کوفہ میں ابو حنیفہ نامی آدمی کون ہے جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے۔ چونکہ یہ محدث، عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے اور دوسری طرف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے استاذ تھے۔ اس لئے وہ اپنے استاذ کا احترام کرتے ہوئے اس وقت تو خاموش ہو گئے۔ اگلے دن انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ معرکۃ الاراء مسائل لکھے، ان مسائل پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نقل کی، اور امام صاحب کی رائے امام ابو حنیفہ کے نام سے نہیں لکھی بلکہ یوں لکھا **"قَالَ نُعْمَانُ"**۔ اور وہ کاغذ اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس پہ لکھے ہوئے مسائل پڑھنا شروع کیے۔ ایک مسئلہ پڑھتے اس پہ **"قَالَ نُعْمَانُ"** کے عنوان سے لکھی ہوئی رائے پڑھتے اور خوب تحسین فرماتے۔ سارے مسائل پڑھنے کے بعد انہوں نے پوچھا کہ یہ نعمان کون ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ وہی ہیں جن کو آپ ابو حنیفہ کے نام سے جانتے ہیں اور جن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ دین میں نئی نئی باتیں نکالتے ہیں، یہ وہی عالم ہیں اور میرے استاذ بھی ہیں۔ یہ نئی باتیں نہیں نکالتے بلکہ تحقیق کر کے بات کرتے ہیں۔ ان محدث صاحب نے فوراً استغفار کیا اور بہت ندامت کا اظہار کیا، فرمایا کہ میں نے اتنے بڑے آدمی کے بارے میں ایسی بات کر کے اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا، اللہ کرے میری ان سے ملاقات ہو جائے تاکہ میں ان سے معافی مانگ

سکوں۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پھر مجھے اللہ پاک نے وہ دن بھی دکھایا کہ جب حرم شریف میں حج کے موقع پر میرے ان دونوں شیوخ کی آپس میں ملاقات ہوئی۔ میرے محدث استاذ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ میں نے آپ کے بارے میں اس قسم کی باتیں کی تھیں، آپ مجھے معاف کر دیں۔

در اصل حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام علم اور تفقہ کے لحاظ بہت اونچا ہے۔ ہم دوسرے ائمہ کو غلط نہیں کہتے۔ وہ بھی بڑے درجہ کے اولیاء اللہ ہیں اور ہمارے سروں کے تاج ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یقین ہے اللہ پاک نے ہمیں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مذہب کی پیروی نصیب کی ہے، یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات ایسی ہیں کہ جتنا وقت گزرتا چلا جائے گا ان تحقیقات میں مزید وضاحت آتی جائے گی۔

متن:

ایک جماعت جس نے یقین کو جِلا یافتہ اور روشن معلوم کیا تو اس نے اس یقین کی نسبت جو جِلا یافتہ اور روشن نہیں، زیادہ کہہ دیا۔ گویا بعض لوگوں نے غیر متجلی یقین کو یقین ہی نہیں سمجھا اور انہی میں سے بعض نے متجلی کو یقین جان کر غیر متجلی کو ناقص کہہ دیا اور دوسرے گروہ نے جو نظر کی تیزی اور بصیرت رکھتے تھے دیکھا کہ یہ کمی و زیادتی یقین کی صفات کی طرف راجع ہے نہ کہ نفسِ یقین کی طرف۔

جو نظر کی تیزی اور بصیرت رکھتے تھے دیکھا کہ یہ کمی و زیادتی یقین کی صفات کی طرف راجع ہے نہ کہ نفس یقین کی طرف۔

تشریح:

حضرت یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ نفسِ یقین میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی بلکہ یقین کی کیفیت میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال شفقِ ابیض کے ذریعے دی جا سکتی ہے، کہ شفق تبدیل نہیں ہوتا مگر اس کی روشنی کبھی مدھم ہو جاتی ہے، کبھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یقین بذات خود کم یا زیادہ نہیں ہوتا مگر اس کی کیفیت میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔

متن:

اس وجہ سے انہوں نے یقین کو غیر زائد و ناقص کہہ دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو آئینے جو باہم برابر ہوں لیکن روشنی اور نورانیت میں تفاوت رکھتے ہوں، جب ایک شخص اس آئینے کو دیکھتا ہے جس میں جِلا اور روشنی زیادہ ہے اور وہ نور اور روشنی کی نمائندگی زیادہ کرتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ آئینہ دوسرے آئینے سے زیادہ روشن ہے کیونکہ اُس میں جِلا و روشنی زیادہ نہیں ہے۔ اور دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں آئینے (کمی و زیادتی میں) برابر ہیں البتہ فرق صرف جِلا کی نمائندگی کا ہے جو ان دونوں کی صفات ہیں۔

تشریح:

آئینے کی صفت اور اس کا کام منعکس کرنا ہے۔ تیز روشنی ہو گی تو آئینہ تیز روشنی منعکس کرے گا، روشنی کم ہو گی تو کم روشنی منعکس کرے گا۔ آئینہ بذات خود وہی رہتا ہے اس پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

متن:

البتہ فرق صرف جِلا کی نمائندگی کا ہے جو ان دونوں کی صفات ہیں۔ پس دوسرے کی نظر صائب ہے اور شئے کی حقیقت تک رسائی رکھتا ہے اور پہلے شخص کی نظر ظاہر پر ہے لہذا کوتاہ ہے اور صفت سے ذات تک نہیں پہنچی ہے۔

آیتِ کریمہ:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (المجادلہ: 11)

ترجمہ: "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا"۔

اس تحقیق سے کہ جس کے اظہار کے لئے اس فقیر کو توفیق بخشی گئی، مخالفین کے اعتراضات جو انہوں نے ایمان کے زیادہ اور کم نہ ہونے پر کئے تھے زائل ہو گئے۔

اور عام مومنوں کا ایمان تمام وجوہ میں انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کے ایمان کے مثل نہیں ہوا، کیونکہ انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کا ایمان تمام تر جلا

یافتہ و نورانی ہے جو ثمرات و نتائج کئی گنا (زیادہ) رکھتا ہے ان عام مومنوں کے ایمان کے مقابلہ پر جو اپنے اپنے درجات کے فرق کے لحاظ سے بہت سی ظلمتیں اور کدورتیں رکھتا ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان جو وزن میں تمام امت کے ایمان سے زیادہ ہے اس کو بھی جِلا اور نورانیت کے اعتبار سے سمجھنا چاہیے اور زیادتی کو صفاتِ کاملہ کی طرف راجع کرنا چاہیے۔

تشریح:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان اور ایک عام گنہگار کا ایمان برابر ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ در اصل اس قول کا تعلق صفتِ ایمان کے ساتھ ہے جو کہ سب میں برابر ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ کو ایک مانتے تھے ہم بھی اللہ کو ایک مانتے ہیں، وہ تمام پیغمبروں کو مانتے تھے ہم بھی تمام پیغمبروں کو مانتے ہیں، وہ تمام کتابوں کو مانتے تھے ہم بھی تمام کتابوں کو مانتے ہیں۔ ایمان کے معاملے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں ایسا کہا جا سکے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس پر ایمان رکھتے تھے اور ہم نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر کسی ایک چیز کے بارے میں بھی یہ بات پائی گئی کہ وہ تو اس پر ایمان رکھتے تھے اور ہم نہیں رکھتے تو معاملہ کفر تک چلا جائے گا۔ لہٰذا یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ہمارا ایمان نفسِ ایمان کے لحاظ سے تو برابر ہے ہاں کیفیت کے لحاظ سے اس میں فرق ضرور ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کیفیتِ احسان سب کو حاصل ہوتی ہے، کیفیت احسان کا مطلب یہ ہے کہ یہ دھیان رہے کہ اللہ ہمیں ہر دم دیکھ رہا ہے، ہر مسلمان کا یہ یقین ہے کہ اللہ اسے ہر وقت دیکھ رہا ہے لیکن اس کی کیفیت میں فرق پایا جاتا ہے، کسی کو یہ بات پختگی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور کسی میں اس کی کیفیت کمزور ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین سوال کئے گئے تھے **"مَا الْإِيْمَانُ؟ مَا الْإِسْلَامُ؟ مَا الْإِحْسَانُ؟"**۔ **"مَا الْإِيْمَانُ"** میں ایمانیات آ گئے، **"مَا الْإِسْلَامُ"** میں اعمال آ گئے اور **"مَا الْإِحْسَانُ"** میں کیفیات آ گئیں۔ یہ تین درجے ہیں، ہر اگلا درجہ پچھلے

درجے سے اعلیٰ ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص ایسا ہو جو صرف پہلے درجے کا حامل ہو، جسے ایمان تو حاصل ہو مگر اس کا کوئی عمل نہ ہو اور کوئی کیفیت بھی حاصل نہ ہو۔ اس سے اعلیٰ درجے کا شخص وہ ہو گا جس کو ایمان حاصل ہو اور وہ اعمال کا پابند بھی ہو۔ تیسرا اور سب سے اعلیٰ درجہ اس شخص کا ہو گا جسے ایمان بھی حاصل ہو، اس کے اعمال بھی صحیح ہوں اور کیفیتِ احسان بھی حاصل ہو۔ اب ان تینوں درجوں کے حامل لوگوں میں ایمان مشترک ہے چاہے پہلا درجہ ہو یا دوسرا یا تیسرا درجہ ہو، ایمان سب میں برابر ہے۔ بعد والے دو درجوں میں ایمان کی کیفیت زیادہ موثر ہے جس کی وجہ سے ان درجوں کے حامل اشخاص اعمال بھی کرتے ہیں اور ان کو کیفیتِ احسان بھی حاصل ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں ولایت کے بارے میں دو آیات آئی ہیں۔ ایک آیت یہ ہے:

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ: 257)

ترجمہ: "اللہ ایمان والوں کا دوست ہے، وہ انھیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے"۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ مومنین کا دوست ہے ان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں ایمان کے علاوہ اور کسی چیز کا ذکر نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایمان اور کفر کا تقابل کیا جائے تو محض ایمان بھی اللہ پاک کی دوستی کا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ دوستی اس معنی میں ہے کہ کفر اللہ پاک کے غضب کا سبب ہے، اس کے مقابلے میں ایمان اللہ پاک کی دوستی کا ذریعہ ہے۔

ولایت کے بارے میں دوسری آیت یہ ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ﴾ (یونس: 62-63)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقوٰی اختیار کئے رہے"۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے دوست وہ ہیں جو نہ صرف ایمان لائے

بلکہ انہوں نے ایمان کے ساتھ ساتھ تقویٰ بھی اختیار کیا۔

پہلی قسم کی ولایت، ولایتِ عامہ ہے۔ جبکہ دوسری قسم کی ولایت، ولایتِ خاصہ ہے۔ ولایتِ عامہ کے لئے ایمان کافی ہے، جبکہ ولایتِ خاصہ کے لئے صرف ایمان کافی نہیں بلکہ تقویٰ بھی ضروری ہے۔

دونوں قسم کی ولایتوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ایمان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی، ایمان سب کا برابر ہوتا ہے۔

اس ساری تفصیل سے ہمارا مقصود اس بات کو واضح کرنا ہے کہ نفسِ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، بلکہ کیفیتِ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا تمام مثالوں میں یہ بات بخوبی سمجھ لی کہ ایک چیز ہر مقام پر پائی جا رہی ہے اور وہ ایمان ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اپنی جگہ ایک سا ہی برقرار رہتا ہے، جبکہ کیفیت میں کبھی کمی ہو جاتی ہے اور کبھی زیادتی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ایمان کے اثرات میں فرق آتا ہے۔

متن:

کیا تم نہیں دیکھتے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نفسِ انسانیت میں عام لوگوں کے ساتھ برابر ہیں اور حقیقت و ذات میں سب باہم متحد ہیں لیکن صفاتِ کاملہ کے اعتبار سے ان (انبیاء) کو دوسرے (انسانوں) پر فضیلت حاصل ہے اور جس میں صفاتِ کاملہ نہیں ہیں گویا وہ اس نوع سے خارج اور اس کے فضائل و خصائص سے محروم ہے لیکن اس تفاوت کے باوجود نفسِ انسانیت میں زیادتی و کمی واقع نہیں۔

تشریح:

اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ درج ذیل مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص بالکل مرنے کے قریب ہے، لیکن ابھی مرا نہیں، اگر اس کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے؟ تو یہی جواب ملے گا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ دوسری طرف ایک جوان اور صحت مند آدمی کو بھی زندہ کہا جائے گا، نفسِ حیات کے اعتبار سے دونوں زندہ ہیں لیکن دونوں کی زندگی کی کیفیت بالکل الگ الگ ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آخری وقت میں ان پر غشی طاری ہو گئی۔ ان کے بیٹے سمجھے کہ شاید نزع کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ انہوں نے امام صاحب کو کلمہ کی تلقین شروع کر دی۔ اب یہ تلقین کر رہے تھے اور امام صاحب فرما رہے تھے کہ "ابھی نہیں ابھی نہیں"۔

ان کے بیٹے یہ دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں یہ سوءِ خاتمہ کی علامت نہ ہو۔ ساری عمر تو امام صاحب متقی، پرہیزگار اور ذاکر و شاغل رہے ہیں لیکن اخیر وقت میں کلمہ پڑھنے کی تلقین پر کہہ رہے ہیں کہ ابھی نہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ خیر، تھوڑی دیر بعد امام صاحب کو افاقہ ہو گیا، غشی ختم ہو گئی۔ بیٹوں نے انہیں ساری بات بتائی تو امام صاحب نے فرمایا "در اصل شیطان میرے سامنے آیا تھا، اپنے سر پہ خاک ڈال رہا تھا اور مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ اے احمد! تو مجھ سے بچ کے چلا گیا۔ میں شیطان کی اس بات کے جواب میں کہہ رہا تھا کہ ابھی نہیں بچا، کیونکہ ابھی میں زندہ ہوں، جب تک زندگی باقی ہے تب تک تیرے جال میں پھنسنے کا خدشہ ہے۔ میں در اصل شیطان کو کہہ رہا تھا کہ ابھی نہیں ابھی نہیں۔"

اب نفسِ ایمان میں تو سارے مسلمان برابر ہوتے ہیں لیکن کیفیات میں فرق ہو سکتا ہے کسی کے ایمان کی کیفیت اتنے اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے جیسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، اور کسی کی ایمانی کیفیت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہونے سے بھی نہیں روک سکتا۔

متن:

اور نہیں کہہ سکتے کہ وہ انسانیت زیادتی و نقصان کے قابل ہے۔ **واللّٰہُ سُبْحَانَہٗ المُلْھِمُ لِلصَّوَابِ** (اللہ سبحانہ و تعالیٰ صحیح بات کا الہام کرنے والا ہے)۔

اور اسی طرح بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "تصدیق ایمانی" سے مراد ان کے نزدیک تصدیق منطقی ہے جو ظن اور یقین دونوں کو شامل ہے، اس صورت میں "نفسِ ایمان" میں کمی و زیادتی کی گنجائش ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اس جگہ تصدیق سے مراد یقین و اذعانِ قلبی (دل سے قبول کر لینا ہے) نہ کہ عام معنیٰ میں جس میں ظن بھی شامل ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا" (میں یقیناً مومن ہوں)۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی" (میں مومن ہوں اگر اللہ تعالیٰ چاہے) حقیقت میں ان کا یہ اختلاف "نزاعِ لفظی" ہے۔ مذہب اول (پہلے قول) کا تعلق ایمان حال سے ہے، اور مذہبِ ثانی (دوسرے قول) کا تعلق مآل و عاقبت کار سے ہے۔

تشریح:

متن کی عبارت میں حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس عقیدہ پر گفتگو فرما رہے ہیں کہ "اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ" (ایمان نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے)۔ یعنی نفسِ ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ صفاتِ ایمان اور کیفیتِ ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں مختلف دلائل بیان فرمائے اور اب اس عقیدہ پر متفرع ایک جزئیہ بیان فرما رہے ہیں۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اپنے ایمان کا اقرار کرنا ہو تو یوں کہا جائے "اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا" (میں یقیناً ایمان والا ہوں)۔ جبکہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یوں کہا جائے: "اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی" (میں ان شاء اللہ ایمان والا ہوں)۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں اقوال میں تطبیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پہلے قول کا تعلق موجودہ حالت سے ہے جبکہ دوسرے قول کا تعلق مآل یعنی آئندہ کی حالت سے ہے۔ آئندہ سے مراد موت کا وقت اور قیامت کا دن ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا ہے کہ اپنے ایمان کا اقرار تاکید اور یقین کے ساتھ کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح کے مطابق اس کا تعلق موجودہ حالت سے ہے۔ یعنی اس وقت ہمارے دل میں ایمان ہے، اور کفر کی ہر بات سے انکار ہے، اعمال صالحہ کی کوشش جاری ہے، گناہوں سے توبہ کا عمل چل رہا ہے، لہٰذا اس وقت ہمیں اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہنا چاہیے کہ الحمد للہ میں یقیناً مومن ہوں۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو مآل پر محمول کیا جائے گا یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی مآل کے اعتبار سے بالکل درست ہے۔ اگر کسی کی

یہ نیت ہو کہ ایمان کی یہی حالت مجھے آخر تک نصیب ہو، حسنِ خاتمہ نصیب ہو تو پھر "اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ" بھی کہہ سکتا ہے۔ یہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بے انتہا علم اور نکتہ رسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اتنے خوبصورت انداز میں دونوں اقوال میں تطبیق دی ہے کہ اختلاف باقی ہی نہ رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی "اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ" اس معنی میں کہتا ہے کہ اسے اپنے ایمان کا یقین ہی نہیں بلکہ شک ہے کہ کیا معلوم میں مومن ہوں بھی یا نہیں، تو اس معنی میں یہ کہنا جائز نہیں بلکہ اس نیت سے کہنے سے تو کفر کا خدشہ ہے۔ ہاں اگر مآل کے اعتبار سے کہتا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

تاتاریوں کے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ تیمور شکار پر نکلا، راستے میں ایک بزرگ کو اذان دیتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کیا عمل ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہمارا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم لوگوں کو عبادت کے لئے بلایا کرتے ہیں۔ شہزادے نے کہا: یہ بتاؤ کہ تمہاری داڑھی اچھی ہے یا میرے کتے کی دُم؟ اس بزرگ نے جواب دیا کہ اگر میں ایمان کے ساتھ دنیا سے چلا گیا پھر تو میری داڑھی اچھی ہے، اگر ایمان کے ساتھ نہ گیا تو پھر تیرے کتے کی دُم مجھ سے بہتر ہے۔

شہزادے پر اس بات کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے پوچھا: ایمان کیا چیز ہے؟ ان بزرگ نے اس سوال کے جواب میں اسے ایمان اور لوازماتِ ایمان کی ساری تفصیل بتا دی۔ اس نے کہا میں ایمان لے آتا ہوں، لیکن ابھی میں حکمران نہیں ہوں، صرف شہزادہ ہوں، اس لئے اپنے ایمان کا اعلان نہیں کروں گا۔ جس وقت میں بادشاہ بن جاؤں اس وقت میرے پاس آ کر مجھے یاد دلا دینا تو میں اپنے اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ کافی عرصہ گزر گیا، یہ بزرگ شہزادہ تیمور کے بادشاہ بننے کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کا وقت آ پہنچا، انہوں نے دمِ آخر میں اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ جس وقت شہزادہ تیمور بادشاہ بن جائے، تب اس کے محل کے قریب جا کر اذان دینا، وہ تمہیں اپنے پاس بلوا لے گا، پھر اسے اس کا وعدہ یاد دلانا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے محل کے قریب اذان دی تو لوگ انہیں پکڑ کر بادشاہ کے

پاس لے گئے۔ تفتیش کرنے پر بتایا کہ میرے والد نے مجھے ایسا کرنے کی وصیت کی تھی، اور اسے سارا واقعہ یاد دلایا۔ اسے یاد آ گیا۔ بادشاہ نے اپنے مشیر خاص کو ساری بات بتائی اور مشورہ کیا تو عجیب بات ہوئی۔ اس مشیر نے کہا کہ میں تو پہلے سے ہی اسلام قبول کر چکا ہوں، صرف حکومت کے ڈر سے اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر پایا۔

پھر دونوں نے مل کے باقی حکومتی ارکان کو قائل کر لیا اور وہ سب بھی مسلمان ہو گئے۔ پھر اللہ نے ان سے اسلام کے حق میں بہت کام لیا۔

ایسے ہی حالات کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

متن:

لیکن صورتِ استثناء سے پرہیز کرنا اولی و احوط ہے۔ **كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُنْصِفِ** (جیسا کہ منصف لوگوں پر پوشیدہ نہیں ہے)۔

عقیدہ (20):

اور اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں اور ان سے بکثرت خوارق عادات واقع ہونے کی وجہ سے ان کی یہ بات عادت مستمرہ (دائمی) بن گئی ہے، اور کرامات کا انکار کرنے والا علم عادی اور ضروری کا انکار کرنے والا ہے۔ نبی کا معجزہ نبوت کے دعوے سے مقرون (ملا ہوا) ہوتا ہے، اور ولی کی کرامت اس معنی میں خالی ہے بلکہ اس نبی کی پیروی کے اعتراف کے ساتھ مقرون (ملی ہوئی) ہوتی ہے **فَلَا اشْتِبَاهَ بَيْنَ الْمُعْجِزَةِ وَالْكَرَامَةِ كَمَا زَعَمَ الْمُنْكِرُوْنَ** (لہذا معجزہ اور کرامت کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں رہا جیسا کہ منکروں نے گمان کیا ہے)۔

تشریح:

یہاں سے عقیدہ نمبر 20 کا بیان ہے، جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں۔

نبی کا معجزہ اس کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے جبکہ ولی کی کرامت بھی در اصل اس کے نبی کا ہی معجزہ ہوتی ہے کیونکہ وہ اس سے صادر ہی اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اپنے نبی کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی ایسے آدمی سے خارقِ عادت

امر ظاہر ہو جو نبی کی پیروی کرنے والا نہ ہو تو اسے کرامت نہیں کہتے بلکہ شیطانی استدراج کہتے ہیں۔

کرامت کے منکرین یہ خیال کرتے ہیں کہ کرامت کو ماننے سے ولی کو نبی ماننا لازم آتا ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے، کیونکہ معجزہ اور کرامت میں واضح فرق ہے۔ معجزہ نبوت کے وسیلے میں ملتا ہے جبکہ کرامت اتباعِ نبوت کے وسیلے میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا اب کوئی اشتباہ نہ رہا۔

متن:

عقیدہ (12):

اور خلفائے راشدین کے درمیان افضلیت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے لیکن شیخین کی افضلیت صحابہ اور تابعین کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اکابرین ائمہ کی ایک جماعت نے جن میں امام شافعیؒ بھی ہیں جنہوں نے اس بات کو نقل کیا ہے کہ "الشیخ الامام ابو الحسن اشعریؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت ابو بکر صدیقؓ کی فضیلت پھر حضرت عمرؓ کی فضیلت بقیہ تمام امت پر قطعی ہے" اور امام ذہبیؒ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ کا یہ قول ان کی خلافت و مملکت کے زمانے میں آپ کے متبعین میں سے ایک جم غفیر کے سامنے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ **اِنَّ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ اَفْضَلُ الْاُمَّةِ** (ابو بکرؓ اور عمرؓ تمام امت میں افضل ہیں)۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو اسی (80) سے زیادہ راویوں نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے روایت کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رافضیوں کا برا کرے یہ کیسے جاہل ہیں۔ اور بخاری نے ان (حضرت علی رضی اللہ علیہ) سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"خَيْرُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اَبُوْ بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ رَجُلٌ اٰخَرُ فَقَالَ ابْنُهٗ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَنَفِيَّةِ ثُمَّ اَنْتَ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ"

(نبی ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں بہتر حضرت ابو بکرؓ، پھر عمرؓ ہیں پھر ایک اور شخص۔ (اس پر) آپ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؒ نے کہا کہ پھر آپ۔ (اس بات پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تو مسلمانوں میں سے ایک فرد ہوں)۔

امام ذہبیؒ وغیرہ نے حضرت علیؓ سے بسند صحیح روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ لوگ مجھے ان دونوں (شیخین) پر فضیلت دیتے ہیں، لہذا جو بھی مجھ کو ان پر فضیلت دیتا ہے وہ مفتری (جھوٹا) ہے اور اس کے لئے وہ سزا ہے جو ایک مفتری کی ہوتی ہے اور دار قطنی نے آپ (حضرت علیؓ) سے روایت کی ہے کہ میں جس کو پاؤں کہ وہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ پر مجھے فضیلت دیتا ہے تو میں اس کو اتنے کوڑے لگاؤں گا جتنے ایک مفتری کو لگنے چاہئیں۔ اس قسم کی اور بہت سی روایتیں خود حضرت علیؓ سے اور آپ کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ اجمعین سے اس کثرت اور تواتر سے آئی ہیں جس میں کسی کو انکار کی مجال نہیں حتی کہ عبد الرزاق جو اکابر شیعہ سے ہے کہتا ہے کہ: "**اُفَضِّلُ الشَّیْخَیْنِ بِتَفْضِیْلِ عَلِیٍّ اِیَّاھُمَا عَلٰی نَفْسِہٖ وَاِلَّا لَمَا فَضَّلْتُھُمَا کَفٰی بِیْ وِزْرًا اَنْ اُحِبَّہٗ ثُمَّ اُخَالِفَہٗ**" (میں شیخین کو اس لئے فضیلت دیتا ہوں کہ خود حضرت علیؓ نے اپنے اوپر ان کو فضیلت دی ہے ورنہ میں ان (شیخین) کو کبھی فضیلت نہ دیتا۔ میرے نزدیک یہ گناہ ہے کہ میں ان (حضرت علیؓ) سے محبت کا دعوی کروں اور پھر ان (کے اقوال) کی مخالفت کروں)۔ یہ سب کچھ صواعق سے لیا گیا ہے۔

لیکن اب رہی حضرت عثمانؓ کی حضرت علیؓ پر فضیلت سو اکثر علمائے اہلِ سنت اس مسلک پر ہیں کہ شیخین کے بعد حضرت عثمانؓ افضل ہیں پھر اس کے بعد حضرت علیؓ۔ اور ائمہ اربعہ مجتہدین کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور بعض لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے بارے میں امام مالکؒ سے جو توقف نقل کیا ہے، اس کے متعلق قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ نے اس توقف سے حضرت عثمانؓ کی فضیلت کی طرف رجوع کر لیا ہے اور قرطبیؒ نے کہا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہی اصح ہے۔ اور اسی طرح وہ توقف جو بعض نے امام اعظمؒ کی اس عبارت سے سمجھا ہے کہ **مِنْ عَلَامَاتِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ تَفْضِیْلُ الشَّیْخَیْنِ وَمَحَبَّۃُ الْخَتَنَیْنِ** (اہل سنت و الجماعت کی علامت میں سے یہ بھی ہے کہ شیخین کو فضیلت دی جائے اور ختنین (دونوں داماد) (حضرت عثمان و حضرت علی سے محبت کی جائے)۔

اس فقیر کے نزدیک اس عبارت کے اختیار کرنے میں ایک دوسرا محل ہے کہ

حضرات ختنین کی خلافت کے زمانے میں بہت زیادہ فتنے و فساد پیدا ہو گئے تھے جس کہ وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بہت کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے امام (ابو حنیفہؒ) نے اس بات کو مد نظر رکھ کر ان کے حق میں محبت کا لفظ اختیار کر لیا ہے اور ان کی دوستی کو علامات اہل سنت سے قرار دیا ہے، بغیر اس امر کے کہ کسی قسم کا توقف ملحوظ ہو، اور کیسے توقف ہو سکتا ہے کیونکہ حنفیوں کی کتابیں ایسے مضامین سے بھری پڑی ہیں کہ ان (خلفائے راشدین) کی فضیلت ان کی ترتیب، ترتیب خلافت کے مطابق ہے۔

مختصر یہ کہ شیخین کی افضلیت یقینی ہے اور حضرت عثمانؓ کی افضلیت ان سے کم درجہ کی ہے۔ لیکن زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے منکر کو بلکہ شیخین کی افضلیت کے منکر کے لئے بھی ہم کفر کا حکم نہ لگائیں البتہ ان کو بدعتی و گمراہ جانیں، کیونکہ ان کی تکفیر میں علماء کا اختلاف ہے اور اس اجماع کے قطعی ہونے میں بہت قیل و قال ہے، اس کا منکر بد نصیب یزید کا ساتھی ہے، اسی احتیاط کی بنا پر اس (یزید) کے لعن طعن کرنے میں توقف کیا ہے۔ اور وہ ایذا جو حضرت پیغمبر علیہ و علیہم الصلوات و التسلیمات کو خلفائے راشدین کو ایذا رسانی کی جہت سے پہنچی ہے وہ ایسی ہے کہ جیسی کہ حضرت امامین (حضرت امام حسن و امام حسین) کو ایذا رسانی کی جہت سے پہنچی ہے۔

تشریح:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کی مخالفت بھی نبی کریم ﷺ کے لئے ایسی ہی اذیت کا باعث ہے جیسے حضرات حسنینؓ کو تکلیف دینا نبی کریم ﷺ کی تکلیف کا موجب ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے شیعہ سنی کے انتہائی اختلافات کے زمانے میں ایسا معتدل رویہ اختیار کیا کہ انصاف کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ساری عمر اہلِ تشیع کے باطل عقائد کے خلاف جہاد کرتے رہے مگر اہلِ بیت کی محبت کا دامن ایسی مضبوطی سے تھامے رکھا کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ آج کل لوگ اعتدال کا رویہ قائم نہیں رکھتے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

اجمعین کی محبت میں اہلِ بیت کو بھول جاتے ہیں اور اہلِ بیت کی محبت میں آئیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ اور اہل بیت کی محبت یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایک دوسرے کی مخالفت کا سبب نہیں ہیں۔ لیکن لوگ اعتدال کا راستہ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ جیسے صحابہ کی حمایت لازم ہے اسی طرح اہلِ بیت کی محبت لازم ہے۔ دونوں کی محبت کے حق میں روایات آئی ہیں۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ اہل بیت صرف اہل بیت ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اعلیٰ درجے کے صحابہ بھی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے سردار ہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں بھی ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔

لہٰذا صحابہ و اہل بیت میں کوئی فرق نہیں سمجھنا چاہیے۔ دونوں کی محبت اور عزت اعلیٰ درجہ پر کرنی چاہیے۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں، قرآن اور سنت چھوڑے جا رہا ہوں، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں قرآن اور اپنی عترت (اہل بیت) چھوڑے جا رہا ہوں۔ لہٰذا دونوں گروہ ہمارے سروں کے تاج ہیں، دونوں کا احترام و ادب ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

آپ ائمہ اربعہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہر دور کا امام اپنے دور کے اہل بیت کے ساتھ کندھے سے کندھے ملا کر کھڑا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں: **"لَوْلَا سَنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ"** "اگر یہ دو سال (جو نعمان نے امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزارے) نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا"۔

جب حضرت امام زید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت کی حکومت کے خلاف خروج کیا تب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے با قاعدہ ان کی مدد کی تھی، کئی سو تولے سونا اور مال و زر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ زیدی اور فقہ حنفی متعدد مسائل میں بہت قریب قریب ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔

اہلِ بیت کے بارے میں احادیث شریفہ میں سفینۂ نوح کی مثال بیان کرتے

ہوئے فرمایا کہ اہلِ بیت سفینۂ نوح کی طرح ہیں۔ جو اس کشتی میں بیٹھ گیا وہ بچ گیا، اور جو اس سے باہر رہ گیا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

لہٰذا حق اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے حضرات کا برابر ادب و احترام کیا جائے۔

مجھے ایک عالم نے عاشوراء کے دن فون کر کے پوچھا کہ آج دس محرم کا دن ہے کیا عمل کیا جائے؟ میں نے کہا آج سارا دن زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھیں اور اس کا ثواب امام حسین رضی اللہ عنہ کو بخش دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اگلے دن فون کر کے کہنے لگے کہ ہم (نعوذ باللہ) یزید زندہ باد کے نعرے لگانے والے تھے، لیکن کل کے دن جو آپ نے درود شریف پڑھ کر اس کا ثواب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ایصال کرنے کا عمل بتایا تو اس سے ہمارے دل بالکل صاف ہوگئے۔

میں نے سوچا کہ ان کی کیفیت کے ذریعے تو اصلاح ہو گئی، اب علمی اصلاح بھی ہونی چاہیے۔ کیونکہ بغیر علمی اصلاح کے کیفیت والی اصلاح کسی وقت واپس بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں نے ان سے سوال کیا کہ اگر کسی صحابی و تابعی میں اختلاف آ جائے تو کس کی بات مانی جائے گی؟ انہوں نے کہا: صحابی کی، اس لئے کہ باقاعدہ احادیث شریفہ کی کتابوں میں آتا ہے کہ "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" (تمام صحابہ عادل ہیں)۔ میں نے کہا تو پھر بتاؤ کہ امام حسین رضی اللہ عنہ صحابی تھے یا تابعی تھے؟ کہتے ہیں صحابی تھے۔ میں پوچھا: یزید تابعی تھا یا صحابی؟ کہنے لگے کہ اس میں کیا اختلاف ہے، وہ تابعی ہی تھا۔ میں نے کہا کہ جب وہ تابعی تھا اور اس کا اختلاف حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہوا تو ہمارے اصول کے مطابق حق پر کون ہوا؟ ظاہر ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ حق پر ہیں۔ الحمد للہ اس سے ان کا دل اور دماغ دونوں صاف ہو گئے۔

بہرحال صحابہ کرام، اہل بیت اور امہات المومنین رضوان اللہ علیہم اجمعین تینوں گروہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہیں، لہٰذا ہمیں تینوں گروہوں کی خوبیوں میں ہی زبان کھولنی چاہیے۔ ایسا کلمہ سوچنا بھی نہیں چاہئے جس سے کسی ایک صحابی کی بے ادبی کا شائبہ تک ہوتا ہو۔

متن:

آنحضرت علیہ و علی الہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:

"اَللّٰهَ اللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِيْ اَللّٰهَ اللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِيْ فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِيْ وَمَنْ آذَانِيْ فَقَدْ آذَى اللّٰهَ وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ اَنْ يَّأْخُذَهٗ" (مسند احمد: 20548)

ترجمہ: "میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ میرے بعد ان کو نشانہ (ملامت) نہ بنانا۔ جس نے ان کو دوست رکھا اس نے گویا میری محبت کے باعث ان کو دوست رکھا۔ اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے گویا میری دشمنی کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے گویا مجھ کو ایذا دی اور جس نے مجھ کو ایذا دی اس نے گویا اللہ تعالیٰ کو ایذا دی (یعنی اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا) اور جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول (علیہ الصلوۃ والسلام) کو ایذا دی قریب ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) اس سے مواخذہ کرے گا"۔

اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (الاحزاب: 57)

ترجمہ: "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ نے دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کی ہے"۔

اور جو کچھ مولانا سعد الدین نے شرح عقائد نسفی میں اس فضیلت کے بارے میں انصاف سمجھا ہے وہ انصاف سے دور ہے اور جو تردید انہوں نے کی ہے وہ سراسر لا حاصل ہے، کیونکہ علماء کے نزدیک یہ بات مقرر ہے کہ اس جگہ افضلیت سے وہ مراد ہے جو خدائے جل و علا کے نزدیک کثرت ثواب کے اعتبار سے ہے، نہ کہ وہ افضلیت جو فضائل و مناقب بکثرت ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہو، کیونکہ ایسی فضیلت عقل مندوں کے نزدیک اعتبار کے لائق ہے۔ اور سلف صحابہ و تابعین نے جس قدر فضائل و مناقب حضرت امیر کے نقل کئے ہیں وہ اور کسی صحابی کی نسبت منقول نہیں۔ حتی کہ امام احمدؒ نے فرمایا "جو فضائل حضرت علیؓ کے بارے میں

آئے ہیں وہ کسی اور صحابی کی نسبت نہیں آئے"۔

تشریح:

بلاشبہ حضرت علیؓ کا مقام بہت اونچا ہے، لیکن اس پر امت کا اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد پوری امت میں سب سے افضل حضرات شیخینؓ ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت علیؓ کی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ یقیناً ان کی بہت زیادہ تعریف اور خوبیاں بیان کرنی چاہئیں اور ان کی مدح پر مشتمل روایات کو عام کرنا چاہیے۔ بلکہ جتنا زیادہ حضرت علیؓ کی تعریف کی جائے گی، حضرات شیخین کا مقام اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے نچلے ہاتھ کو جتنا اوپر اٹھائیں اوپر والا ہاتھ مزید اوپر ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں بڑی عجیب تحقیق کی ہے۔ فرمایا: "**خَيْرُالْقُرُوْنِ قَرْنِيْ**"۔ اس جملہ میں "**قَرْنِيْ**" کے لفظ میں یہ نکتہ ہے کہ "**ق**" سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف اشارہ ہے، "**ر**" سے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ ہے، "**ن**" حضرت عثمانؓ کی طرف اشارہ ہے اور "**قرنی**" کے آخر میں جو "**ی**" ہے اس سے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ ہے۔ در اصل یہ ترتیب کوئی انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ ہے۔ اللہ پاک نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جو کام لینا تھا وہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا، اس کے لئے صدیق ہی بنے تھے، وہ کام پہلے ہونا تھا، بعد میں نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تشکیل کی گئی تھی۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے، تب بیک وقت کئی بڑے بڑے مسائل سامنے آ گئے، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بیک وقت تمام محاذوں پہ کام کیا، کسی ایک کو بھی موقوف یا مؤخر نہیں کیا۔ بعض مسئلوں میں کچھ صحابہ کرام متردد ہو گئے تھے، بعض صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ کچھ محاذوں پر ابھی کام نہ کیا جائے انہیں مؤخر کر دیا جائے لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا: خواہ کچھ بھی ہو جائے ہمیں تمام محاذوں پہ کام کرنا ہے، چاہے مجھے اکیلے ہی کیوں نہ کرنا پڑے میں ضرور کروں گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ابو بکر پر رحم کرے ان کی وجہ سے ہم بچ گئے۔

کچھ بہت بڑے کام تھے جو اللہ پاک نے حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے لئے۔ گو ان کی خلافت کی مدت ڈھائی سال ہے لیکن یہی ڈھائی سال اگلی تمام خلافتوں کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعد کی خلافتوں میں جتنے کام ہوئے ان کی بنیاد حضرت ابو بکر صدیق ؓ اپنے دور میں قائم کر کے گئے تھے۔ اگر وہ بنیاد نہ بناتے تو درست عمارت کیسے بنتی۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ نے وہ کام سرانجام دیئے جو دور اندیشی سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے کیے گئے تمام کام ایسے ہیں جن میں استقامت، اور یقین محکم درکار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لئے جن کی بنیاد استقامت اور یقین محکم کے ذریعے مضبوط ہوتی ہے اور حضرت عمر ؓ سے وہ کام لئے جو دور اندیشی کے ہیں۔ حضرت عمر ؓ کو اللہ پاک نے ایسی فراست اور دور اندیشی عطا فرمائی تھی کہ آپ نے جو قوانین بنائے وہ آج ترقی یافتہ ممالک میں Umar laws کے نام سے نافذ کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی محکمے ایسے ہیں کہ حضرت عمر ؓ سے پہلے دنیا میں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا آپ نے پہلی مرتبہ وہ محکمے قائم کئے۔ ایسے کاموں کی ایک طویل فہرست ہے جو آپ حضرت عمر ؓ کی سیرت میں دیکھ سکتے ہیں۔ مستشرقین کا کہنا ہے کہ اگر ایک عمر اور ہوتے تو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین نہ رہتا۔

حضرت عثمان ؓ سے اللہ پاک نے بے مثال قربانی لی ہے۔ جب بلوائیوں نے حملہ کیا تو خلیفہ ہونے کے با وجود اپنے حق میں تلوار نہیں چلائی۔ بلوائیوں اور فسادیوں کی ہر شرارت کے جواب میں دو باتیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اے عثمان! اللہ پاک تجھے ایک قمیص پہنائے گا لوگ تجھ سے وہ قمیص اتروانا چاہیں گے مگر تم اسے مت اتارنا۔ اور وہ قمیص خلافت ہے، لہٰذا میں خلافت سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر مسلمانوں کے درمیان ایک دفعہ تلوار چل گئی تو پھر وہ رکے گی نہیں، چلتی ہی رہے گی۔ لہذا میں نہیں چاہتا کہ میرے ہوتے ہوئے میری وجہ سے مسلمانوں میں تلوار چلے۔ حضرت علی ؓ نے حضرات حسنین ؓ ما کی ذمہ داری لگائی کہ وہ حضرت عثمان ؓ کے دروازے پہ پہرا دیں، کوئی اندر نہ

جانے پائے۔ اس دروازے سے کوئی نہیں جا سکا، پھر حضرت عثمان ؓ سے قتال کی اجازت مانگی گئی کیونکہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر قتال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن حضرت عثمان ؓ نے قتال کی اجازت نہیں دی۔ جب داخلی دروازے سے کوئی حملہ آور اندر نہ جا سکا تو وہ بد بخت پیچھے سے دیوار پھلانگ کے آ گئے اور حضرت عثمان ؓ کو شہید کر دیا۔ حضرت عثمان ؓ نے حملہ آوروں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا، اپنے اوپر حملہ کرتے ہوئے دیکھا لیکن فوج کو ایک مرتبہ بھی حکم نہیں دیا کہ ان کو گرفتار کرو اور ان سے قتال کرو۔ آپ حِلم کا پہاڑ تھے۔ اس درجہ کا حِلم اور برد باری اللہ پاک نے حضرت عثمان ؓ کے ذریعے ظاہر کروائی۔

حضرت علی ؓ کا اپنا بہت اونچا مقام ہے۔ آپ بہت بڑے فقیہ تھے، مشکل سے مشکل مسئلے چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ جو فتنہ حضرت علی ؓ کے دور میں آیا، اگر یہ کسی اور کے دور میں آتا تو حضرت علی ؓ جیسی فقاہت تو کسی میں نہ تھی، اس لئے وہ مسئلہ حل نہ ہو پاتا۔ اللہ پاک نے ان کو جس کام کے لئے بنایا تھا ان سے وہی کام لیا، آج بھی مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہو تو فیصلہ حضرت علی ؓ کے قول کے مطابق کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا تمہیں ابتلا میں ڈالا جائے گا، ایسے ابتلا میں جس میں تم سے پہلے کوئی نہ آیا ہوگا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک شقی (بد بخت) ہو گا جو تیری داڑھی کو تیرے خون سے سرخ کر دے گا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس امت کا سب سے بڑا شقی وہ ہے جس نے علی ؓ کو شہید کیا۔ اس خبیث شقی کا نام ابن ملجم تھا۔ جس وقت اسے قصاص میں مارا جانے لگا تو جب اس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے کچھ نہیں کہا، پیر کاٹے گئے تو اس نے کچھ نہیں کہا، کان کاٹے گئے تو کچھ نہیں کہا، آنکھوں میں گرم سلائی ماری گئی، آنکھیں بہہ گئیں تو کچھ نہیں کہا، لیکن جب اس کی زبان کاٹی جانے لگی تو رونے لگ گیا، پوچھا گیا کہ اب تمہیں ندامت ہو رہی ہے؟ کہنے لگا میں اس زبان سے روزانہ ستر ہزار مرتبہ ذکر کرتا ہوں، اس لئے رو رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ خارجیت اتنی بڑی غلاظت ہے کہ ذکر کے ذریعے سے بھی کم نہیں ہو سکتی۔ خارجی کی نظر اپنے اوپر ہوتی ہے کہ میں جو سوچتا ہوں بس

وہی ٹھیک ہے، وہ کسی اور کی سوچ کو نہیں مانتا اور خود سے اختلاف کی اجازت نہیں دیتا۔ آج بھی جو لوگ ان کے نقشِ قدم پہ چلتے ہیں ان کا حال ایسا ہی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں بہترین فیصلہ فرمایا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں حضرت نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ پاک نے ہمیں دعا کا طریقہ سکھلاتے ہوئے حکم دیا ہے کہ اللہ پاک سے سیدھا راستہ مانگو، اور سیدھا راستہ ان لوگوں کا ہے جن پہ اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، اور وہ لوگ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک چاہتے ہیں کہ ہم رجال اللہ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے نقشِ قدم پہ چلیں اور رجال الشیطان کی پیروی سے بچیں۔ پھر اس کے فوراً بعد سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ہی کتاب کا ذکر فرمایا کہ یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ھدایت کے لئے دونوں چیزیں ضروری ہیں، رجال اللہ بھی ضروری ہیں اور کتاب اللہ بھی ضروری ہے۔ جو لوگ صرف رجال کو لیتے ہیں کتاب کو نہیں لیتے وہ گمراہ ہیں۔ (جیسے فاطمین) اور جو لوگ صرف کتاب اللہ کو لیتے ہیں، رجال اللہ کو نہیں لیتے وہ بھی گمراہ ہیں (جیسے خوارج)۔

ایک مرتبہ میں ایک علاقے میں بیان کرنے کے لئے گیا۔ وہاں کے لوگ ذرا متعصب قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔ جب میں بیان کر چکا تو تقریباً پچاس، ساٹھ لوگوں نے بیعت بھی کر لی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی دعوت پر میں دوبارہ بیان کے لئے گیا تو ان متشددین نے کچھ شرارت کی کہ قرآن مجید کی ایک آیت کو سامنے رکھ کر کہا کہ دیکھیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو ہی اپنا راہنما بنانا چاہیے، لہٰذا پیر قرآن ہی ہو سکتا ہے کوئی آدمی پیر نہیں ہو سکتا۔

خیر اس وقت میں نے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا اور بیان شروع کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بیان کرنے کے بعد آخری پانچ منٹ میں ان کے اس اعتراض کا جواب دیا۔ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تفسیر عرض کی کہ رجال اللہ اور کتاب اللہ دونوں ضروری ہیں، دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنے سے گمراہی کا خطرہ ہے۔

خوارج صرف کتاب اللہ کو مانتے تھے۔ حضرت علی ؓ جب ان کی سر کوبی کے لئے گئے تو پہلے بات چیت کے لئے حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ کو بھیجا۔ بعد میں خود تشریف لے گئے۔ خوارج چونکہ ہر بات کو قرآن سے ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس لئے حضرت علی ؓ نے ان کے سامنے قرآن رکھا اور قرآن سے مخاطب ہو کر کہا: "**يَامُصْحَفُ كَلِّمِ النَّاسَ**" (اے مصحف! لوگوں سے بات کر)۔ خوارج کہنے لگے کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، بھلا قرآن کیسے بات کرے گا؟ حضرت علی ؓ نے فرمایا: میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ اگر تم صرف قرآن کو مانتے ہو، کسی اور چیز کو نہیں مانتے تو پھر قرآن ہی تم سے بات کرے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ نے فرمایا تھا کہ خوارج کے ساتھ حدیث پہ بات کرنا، قرآن پہ بات نہ کرنا، کیونکہ یہ قرآن کے معنی اپنی مرضی کے ایجاد کر لیں گے، اپنی طرف سے مفہوم گھڑ لیں گے۔

خیر میں نے یہ ساری تفصیل اس درس میں بیان کی تو الحمد للہ لوگ سمجھ گئے اور 11 لوگ مزید سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ اس لئے میں ہمیشہ یہ بات کہتا ہوں کہ دین میں تشدد اور تعصب نہیں کرنا چاہیے۔

متن:

اس کے با وجود تینوں خلفاء کی فضیلت کے بارے میں حکم کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ افضلیت کی وجہ ان فضائل و مناقب کے علاوہ کچھ اور ہے، اور اس افضلیت کی اطلاع "دولت وحی" کے مشاہدہ کرنے والوں کو میسر ہے جنہوں نے صریح طور پر یا قرائن سے معلوم کیا ہے اور وہ پیغمبر علیہ و علیہم الصلوات و التسلیمات کے صحابہ ہیں۔ لہذا جو کچھ شارح عقائد نسفی نے بیان کیا ہے کہ افضلیت سے مراد کثرت ثواب ہے تو وہ توقف کی گنجائش سے ساقط ہے کیونکہ توقف کے لئے اس وقت گنجائش ہوتی ہے جب کہ اس افضلیت کو صاحبِ شریعت کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً معلوم نہ کر لیا ہو۔ اور جب معلوم کر لیا ہے تو پھر توقف کیوں۔ اور اگر معلوم نہیں کیا تو افضلیت کا حکم کیوں کریں اور جو شخص سب کو برابر سمجھتا ہے اور ایک دوسرے پر افضلیت دینا بے کار سمجھتا ہے وہ فضول اور لا حاصل ہے۔ وہ عجیب

احمق ہے جو اہلِ حق کے اجماع کو فضول و بے کار سمجھتا ہے۔

شاید فضل کا لفظ اس کو فضولی کی طرف لے گیا ہے۔ اور جو کچھ صاحبِ فتوحات مکیہ کہتے ہیں کہ ان کی خلافت کی ترتیب کا سبب ان کی عمروں کی مدتوں سے ہے۔ (یہ بات) ان کی فضیلت میں مساوات پر دلالت نہیں کرتی۔ کیونکہ خلافت کا معاملہ دوسرا ہے اور افضلیت کی بحث دوسری ہے اور اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جو ان (شیخ اکبرؒ) کی شطحیات سے ہیں ان کی شان کے لائق نہیں ہیں، ان کے اکثر کشفیہ معارف جو اہل سنت کے علوم سے جدا واقع ہوئے ہیں وہ صواب سے دور ہیں، لہذا ایسی باتوں کی متابعت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل بیمار ہے یا مقلد محض ہے۔

اور صحابہ کے درمیان جو لڑائی جھگڑے واقع ہوئے ان کی اچھے معنوں میں تاویل کرنی چاہیے اور نفسانی خواہش و تعصب سے دور رکھنا چاہیے تفتازانیؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افراطِ محبت کے باوجود فرماتے ہیں "جو مخالفات و محاربات (جنگ و جدال) ان (صحابہ) کے درمیان واقع ہوئے ہیں وہ خلافت کا نزاع نہ تھا بلکہ خطائے اجتہادی کے سبب سے تھا اور اس (شرح عقائد) کے حاشیہ "خیالی" میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی اطاعت سے بغاوت کی اور ساتھ ہی اس امر کا اعتراف بھی کیا کہ وہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) تمام اہلِ زمانہ سے افضل ہیں اور وہ امامت کے ان سے زیادہ حق دار ہیں۔ ایک شبہ کی وجہ سے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص نہ لینا تھا اور حاشیہ قرہ کمال (کمال الدین اسمعیل) میں حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہمارے جن بھائیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی وہ فاسق و کافر نہیں ہیں کیونکہ ان کے لئے تاویل ہے" اور اس میں شک نہیں کہ خطائے اجتہادی ملامت اور طعن و تشنیع سے بہت دور ہے۔

حضرت خیر البشر علیہ و علی آلہ الصلوات و التحیات کے حقوق صحبت کی رعایت کر کے تمام صحابہ کرام کو نیکی کے ساتھ یاد کرنا چاہیے اور پیغمبر علیہ و علی آلہ الصلوات والتسلیمات کی دوستی کی وجہ سے ان کو دوست رکھنا چاہیے۔ (کیونکہ) آنحضرت علیہ

وعلی آلہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:

"مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ" (سنن ترمذی: 3862)

ترجمہ: "جس نے ان (صحابہ) کو دوست رکھا اس نے میری محبت کی وجہ سے ان کو دوست رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا"۔

یعنی وہ محبت جو میرے اصحاب سے متعلق کی گئی ہے ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ مجھ سے متعلق ہے اور اسی طرح وہ بغض جو ان سے تعلق رکھتا ہے ایسا ہی بغض ہے جیسا کہ مجھ سے کیا جائے۔

تشریح:

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ پاک نے خصوصی طور پر نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین کے فروغ کے لئے چن لیا تھا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کو بھی ان کے ساتھ محبت تھی اور صحابہ کرام کو بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت تھی۔ اللہ جل شانہ کو بھی صحابہ کرام کے ساتھ محبت تھی اور صحابہ کرام کو بھی اللہ پاک کے ساتھ محبت تھی۔ اس وجہ سے جو صحابہ کرام کے ساتھ محبت رکھتے ہیں وہ نبی کریم اور اللہ پاک کی محبت کے مستحق بن جاتے ہیں اور جو ان کے ساتھ بغض رکھتے ہیں وہ اللہ پاک کے غضب کے مستحق بن جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نسبت کا خیال نہیں رکھا اور صحابہ کرام کی صحابیت کی قدر نہیں کی، اور اللہ پاک یہ گناہ معاف نہیں فرماتے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ جنہوں نے ان کے ساتھ محبت رکھی در اصل انہوں نے میرے ساتھ محبت رکھی اور جنہوں نے ان سے بغض رکھا در اصل انہوں نے مجھ سے بغض رکھا۔

متن:

ہم کو حضرت امیر (علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ کرنے والوں سے کوئی دوستی نہیں ہے بلکہ مناسب ہے کہ ہم ان سے بیزار ہوں، لیکن چونکہ وہ سب پیغمبر ﷺ کے اصحاب کرام ہیں "کہ ما بمحبتِ ایشاں ماموریم و از بغض و ایذائے ایشاں ممنوع" یعنی

ہم کو ان کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم ہے اور ان کے ساتھ بغض و ایذا رسانی سے روک دیئے گئے ہیں۔ اس لئے لازماً ہم بھی پیغمبر علیہ و علیہم الصلوات والتسلیمات کی دوستی کی وجہ سے تمام صحابہ کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بغض و ایذا رسانی سے دور رہتے ہیں کیونکہ ان سے بغض و ایذا کا معاملہ سرور عالم تک پہنچتا ہے لیکن جو محق (حق پر) ہے ہم اس کو حق والا ہی کہیں گے اور مخطی (بلا قصد خطا وار) کو مخطی حضرت امیر (علیؓ) حق پر تھے اور ان کے مخالف خطا پر۔ اس سے زیادہ کہنا فضول ہے

تشریح:

خطا مختلف وجوہات سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی کو پورا علم نہ ہو، یا کسی کو وہ بات پوری طرح سمجھ نہ آئی ہو۔

یہ معاملہ ایسا عجیب اور نازک ہے کہ اگر آپ ایک فریق کی سن لیں تو اسی کو حق پر سمجھیں گے جب تک کہ دوسرے کو نہ سن لیں۔ اگر دوسرے کو پہلے سن لیں تو آپ کو یوں لگے گا کہ وہی حق پر ہے۔

جنہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اختلاف کیا ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمان سے قصاص کیوں نہیں لیا۔ دوسرا ان کا یہ کہنا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلین میں سے کچھ لوگ جو حضرت علیؓ کی فوج میں مل گئے ہیں ان کو فوج سے نکال باہر کیوں نہیں کیا۔

اگر آپ کو صرف اتنی ہی بات بتائی جائے اور دوسرے فریق کا موقف سنایا ہی نہ جائے تو آپ کو یہ مطالبات بالکل حق بجانب لگیں گے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا موقف یہ تھا کہ اصول یہ ہے کہ حد خلیفہ ہی نافذ کر سکتا ہے، قصاص خلیفہ ہی لے سکتا ہے۔ جب تک آپ لوگ مجھے خلیفہ نہیں مانتے تب تک میں قاتلینِ عثمان سے قصاص کیسے لے سکتا ہوں؟ اگر مجھے خلیفہ بنایا جائے گا تو پھر یہ کام میری ذمہ داری بن جائے گا۔ لہٰذا پہلے مجھے خلیفہ مان کر میرے ہاتھ پہ بیعت کرو پھر اس کے بعد قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کا مطالبہ کرو۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا موقف بالکل درست تھا،

دوسری طرف کے حضرات اجتہادی خطا پر تھے۔ دونوں طرف کے حضرات میں سے گناہ گار کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کے پیروؤں کے لئے دگنا اجر ہے، کیونکہ آپ اپنے اجتہاد میں مُصیب (حق پر) ٹھہرے، جبکہ دوسرے فریق کے لئے ایک اجر ہے کیونکہ وہ اپنے اجتہاد میں مخطی ٹھہرے۔ اور اجتہاد اگر درست نکلے تو دگنا اجر ملتا ہے، اور اگر غلط نکلے تو ایک اجر ملتا ہے۔ گناہ کسی صورت میں نہیں ملتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے عام مسائل میں ائمہ کا اجتہادی اختلاف ہوتا ہے۔ جیسے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین اور دوسرے اجتہادی اختلافی مسائل ہیں۔ در حقیقت ان مسائل میں دونوں طرف کے لوگوں میں سے گمراہ یا گناہ گار کوئی بھی نہیں ہوتا، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ایک فریق کو دگنا اجر ملتا ہے اور دوسرے فریق کو ایک گنا اجر ملتا ہے۔ دگنے اجر والا فریق کون سا ہے اور ایک گنا اجر والا فریق کونسا ہے، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

ائمہ کرام کے درمیان اجتہادی اختلاف عبادات اور معاملات کے مسائل میں ہوتا ہے اور صحابہ کرام کے درمیان اُس موقع پر قتال کے بارے میں اختلاف ہو گیا تھا، معاملہ اجتہادی ہی تھا اس لئے دونوں طرف کے حضرات اجر کے مستحق ٹھہرے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو مشاجراتِ صحابہ کے مسئلے میں آگے بڑھنے سے روکا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر میرے کسی صحابی کے بارے میں پتا چل جائے کہ اس نے قتل کیا ہے پھر بھی اس کے بارے میں بے ادبی کی بات نہ کرو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حد تک فرما دیا ہے تو اب ہماری کیسے جسارت ہوتی ہے کہ ہم اس معاملے میں زبانیں دراز کریں۔ لہٰذا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہم بھی بالکل اس طرح کریں گے۔ اللہ پاک ہم سب کو سمجھ کی توفیق عطا فرمائے

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
اَمَّا بَعْدُ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

خیبر پختونخواہ میں ایک بہت بڑے بزرگ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں۔ ہمارے جدِ امجد ہیں اور جو حضرات بزرگوں کے مقامات کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ خیبر پختونخواہ میں ان کے بعد ان کے درجے کا کوئی ولی اللہ نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حلیم گل بابا کے نام سے معروف ہیں، بہت بڑے شیخ تھے، انہوں نے مقالات لکھے ہیں، مقالہ چہارم اللہ جلّ شانہ کی معرفت کے بارے میں ہے۔

متن:

مقالۂ چہارم، اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں:

یہ بات جان لینی چاہیے کہ معرفت مومن کی روح کا جوہر ہے۔ جس کسی کو معرفت حاصل نہیں وہ خود موجود نہیں۔ صانع یعنی بنانے والے کی پہچان اور معرفت مصنوع سے حاصل ہوتی ہے۔

تشریح:

یعنی جو چیز جس نے بنائی ہے اس سے اس کی معرفت ہوتی ہے۔

متن:

پہلی معرفت یہ ہے کہ تمام چیزوں اور ساری کائنات کو مغلوب، عاجز اور محکوم پہچانا جائے۔

تشریح:

یعنی تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سامنے عاجز، مغلوب اور محکوم ہیں۔

متن:

اور اپنی نیت سب سے قطع کرے۔

تشریح:

یعنی صرف اور صرف اللہ کی رضا مطلوب ہو۔

متن:

اور یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کی ذات و صفات قدیم ہیں۔

تشریح:

یعنی اللہ جلّ شانہ کی صفات بھی قدیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات بھی قدیم ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک ہے، اس میں ہمیشگی ہے۔

متن:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: 11)

ترجمہ: "کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، سب کچھ دیکھتا ہے۔"

اور صانع کی معرفت کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ جیسا کہ کہا گیا ہے **"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"**

ترجمہ: "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔"

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنی قدرت کو آسمانوں اور کائنات میں ظاہر فرمایا اور وہ قدرت کاملہ یہ ہے کہ کائنات کی اشیاء کو نیست و ہست اور موجود و فنا کرتا ہے اور مخلوقات کے حالات کو تغیّر دیتا ہے۔ دن رات کا پیدا کرنا اور ان میں کمی بیشی کرنا اور فراخی و تنگی کو اپنی مخلوقات کے درمیان پیدا کرنا اور حکومت کا لینا اور دینا اور جو کچھ کہ دنیا کے حالات ہیں وہ آفاق میں ظاہر کر لیتا ہے۔

تشریح:

اصل میں جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے وہ ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتا

ہے۔ کیونکہ اس کو پتا ہوتا ہے کہ جس نے مجھے کوئی بھی نعمت دی ہے وہ واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ مثلاً گزشتہ دور کے بادشاہوں کے دربار میں جو شخص بادشاہ سے بات کرنا چاہتا تو اس سے پہلے ایک فقرہ ضرور بولتا کہ "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟" کیونکہ اس کو پتا ہوتا تھا کہ بادشاہ کسی بات پہ بھی ناراض ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہر وقت انسان خطرے میں ہوتا تھا۔

اِس دور میں بھی جو لوگ حکومت کے قریب ہوتے ہیں وہ پریشانی میں ہوتے ہیں۔ درمیان میں فرق بہت زیادہ ہے اس وجہ سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ پتا نہیں کسی بات پہ ناراض ہو کر میرے بارے میں کیا فیصلہ کر دے؟ اسی طرح جو اللہ جلّ شانہ کی صفات کی معرفت رکھتا ہے وہ ہمیشہ لرزاں و ترساں رہے گا۔

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ بڑے عارفین میں سے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا مقام عطا فرمایا تھا۔ سلطان العارفین کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

عدل کرے تاں تھر تھر کمبن اُچیاں شاناں والے
فضل کرے تاں بخشے جاون میں جیہے مُنہ کالے

یعنی اگر اللہ پاک عدل کرے تو اونچی شان والے بھی تھر تھر کانپتے ہیں اور رحم کرے تو مجھ جیسا منہ کالا بھی بخشا جائے گا۔ اور بھی ان کے اشعار ہیں۔ جیسے: "الف اللّٰہ چنبے دی بوٹی"۔ مقصد یہ ہے کہ ان حضرات نے چونکہ دیکھا، محسوس کیا، سنا، جانا اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک ایسا ہو گیا کہ وہ ہر وقت مستحضر رہتی ہیں۔

وقتی طور پہ ایک چیز کا جاننا اور بات ہے اور ایک عمل کے وقت جاننا دوسری بات ہے۔ بعض لوگ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن عین وقت پہ ان کو ادراک اور استحضار نہیں ہوتا، نتیجتاً رہ جاتے ہیں۔ بعض لوگ علم کے لحاظ سے تھوڑا جانتے ہیں لیکن وقت پر ان کو یاد ہوتا ہے تو ما شاء اللہ آگے چلے جاتے ہیں۔

ایک فقیر بادشاہ کے پاس آیا اور کہا: **اَلسَّلامُ عَلَیْکُمْ یَا اَیُّھَا الزَّاھِد** "اے زاہد آپ کے اوپر سلام ہو" بادشاہ نے کہا: خبر بھی ہے کہ میں کون ہوں؟ فقیر نے کہا: آپ بادشاہ ہیں۔ کہتا ہے: بادشاہ زاہد ہوتا ہے؟ فقیر نے جواب دیا: بادشاہ یہ دنیا تھوڑی ہے یا وہ دنیا تھوڑی ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ یہ دنیا تھوڑی ہے۔ فقیر بولا: آپ اس دنیا پہ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں یا اس دنیا پہ لگائے بیٹھے ہیں؟ بادشاہ فوراً سمجھ گیا اور کہا: صحیح کہتے ہو - جزاک اللہ۔ یہ زاہد کا استحضار ہے۔ یعنی زاہد کا عرف میں معنیٰ یہی ہے کہ دنیا کو چھوڑ دے لیکن اس بزرگ نے مشاہدہ کر کے بادشاہ کو بتایا کہ حقیقت میں آپ آخرت کو چھوڑ رہے ہیں جو بہت بڑی چیز ہے۔ اس معنی میں آپ زاہد ہیں۔ یہی معرفت ہے۔

متن:

اور جو کچھ کہ دنیا کے حالات ہیں وہ آفاق میں ظاہر کر لیتا ہے۔ تاکہ موحّدین اور توحید پرست لوگ ان نشانیوں کو دیکھ کر معرفت حاصل کریں۔

تشریح:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں بھی اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران: 27)

ترجمہ: "اور تو ہی بے جان چیز میں سے جاندار کو بر آمد کر لیتا ہے اور جاندار میں سے بے جان چیز نکال لاتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔"

واقعتاً اللہ جلّ شانہ کی ذات کے بارے میں علم ہوتا رہے تو اس کی پھر اپنی ہی شانیں ہیں۔ اگر صفات اس طرح ظاہر ہو جائیں جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے تو اس وقت انسان اللہ کی محبت میں بے بس ہوتا جاتا ہے اور اگر صفات کا ظہور ایسا ہو کہ جس سے خوف طاری ہو جائے تو اس وقت انسان خوف

سے تھر تھر کانپ رہا ہوتا ہے۔ خوف اور محبت دونوں ہی بڑے اونچے مقامات ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ اگر کسی کی آنکھوں سے تنہائی میں خوف یا محبت کی وجہ سے آنسو کا قطرہ نکلے تو اس پر اللہ جلّ شانہ بہت زیادہ نوازتے ہیں۔ یہ سب معرفت کی برکت سے ہوتا ہے۔

متن:

جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ﴾ (حم السجدۃ: 53)

ترجمہ: "ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں بھی دکھائیں گے۔"

چونکہ آفاق کا یہ راستہ عارف کے واسطے بہت دراز اور طویل تھا اس لئے ایک چھوٹا اور مختصر راستہ بھی بتلا دیا اور فرمایا ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات: 21)

ترجمہ: "اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟"

آدمی کے نفس کو موجودات کی مثال پر بنایا ہے اور اس کو اپنی معرفت کے لئے ایک سیڑھی بنا رکھا ہے تاکہ اپنے نفس کو پہچان جائے تو وہ صانع کو خود بخود پہچان جائے گا اور وہ معرفت خود اپنے نفس کی تفسیرِ احوال ہے۔ مثلاً بیماری، تندرستی، نیند، بیداری، موت، زندگی، غمی اور شادی اور فِی الْاٰفَاقِ کے معنی ہیں کہ سب مخلوق کا تغیّر و تبدیلی ان کے اختیار و ارادہ کے بغیر اس بات کی دلیل ہے کہ ایک مدبّر اور قادر موجود ہے۔

تشریح:

اللہ جلّ شانہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ اگر اللہ ایک نہ ہوتا تو یہ سارے انتظامات کیسے صحیح صحیح ہوتے؟ انسان بعض چیزوں کو براہِ راست جانتا ہے اور بعض چیزوں کو براہِ راست نہیں جانتا ہے۔ سائنس کی دنیا میں سب سے زیادہ چیزیں بالواسطہ جاننے کی وجہ سے ہیں۔ اصل میں سائنس دان بیچارے ہوتے ہیں، یہ بہت کچھ جاننے کے با وجود بھی اس لئے محروم ہوتے ہیں کہ اپنے حالات سے تھوڑا سا

باہر نکل کے نہیں سوچتے۔ بعض دفعہ تھوڑا سا باہر نکل کر سوچنے کی بات ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے جو سارا نظام بنایا ہوا ہے اس میں ہم لوگ سب کچھ بالواسطہ جانتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں بہت ساری دریافتیں ایسٹرو فیزکس کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ ایسٹرو فیزکس سارے کا سارا بالواسطہ ہے۔

ستاروں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہے اور یہ اتنا بڑا ستارہ نہیں ہے بلکہ ایسے ستارے موجود ہیں جن میں ایک ارب سورج سما سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی راکٹ اس کے رخ پہ چلا جائے تو زہرہ تک بھی نہ پہنچ پائے گا اور جل جائے گا۔ ایک راکٹ بھیجا گیا تھا، اس کا چند منٹوں کے بعد سگنل آیا تھا کہ میں پگھل رہا ہوں اور ختم ہو گیا۔ پہلے عطارد ہے اس کے بعد زہرہ ہے اس کے بعد زمین ہے۔ یہاں اتنی گرمی ہے تو اس سے آگے کتنی گرمی ہو گی! پھر باقی بڑے ستاروں کا کیا حال ہو گا؟ وہاں تک پہنچ تو نہیں سکتے لیکن سارے بالواسطہ پیمانے جیسے pyrometry وغیرہ دور سے اس کا با قاعدہ درجہ حرارت معلوم کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت ساری چیزیں جو بالواسطہ پیمائش ہیں، اس سے ہم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً بجلی کو کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کی معرفت سب کو معلوم ہے کہ پنکھا اس کے ساتھ چلتا ہے، بلب اس کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: بجلی آ گئی تو بجلی کو آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ بجلی کی وجہ سے روشن چیزوں کو اور بجلی سے چلتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر آدمی کہتا ہے کہ بجلی آ گئی۔ بعینہٖ اللہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن لوگ مظاہرِ قدرت دیکھ رہے ہیں اور مسلسل دیکھ رہے ہیں، پھر کیسے اللہ کو نہیں پہچان رہے؟ سائنس بجلی کو نہیں دکھا سکتی وہ یہ کہتے ہیں کہ بجلی آ گئی۔ تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی ضد کیوں کرتے ہیں؟ جب بجلی کو نہیں دکھا سکتا اور اس کے بارے میں بالواسطہ کہتا ہے کہ بجلی آ گئی، اسی طریقے سے اللہ جل شانہ کے مظاہرِ قدرت سے یہ خود اندازہ لگا کر کیوں نہیں کہتا کہ اللہ ہے؟ دوسری بات اللہ ہے اور اللہ ایک ہے یہ دونوں باتیں عقل سے ثابت ہیں۔ اس لئے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ اسلام کی دعوت

کسی طریقے سے نہ پہنچی ہو، ویسے تو آج کل یہ محال ہے لیکن اگر کسی طریقے سے نہ پہنچی ہو اور وہاں لوگ ہوں تو آخرت میں ان کا کیا بنے گا؟ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ان سے صرف اتنا ہی مطالبہ ہو گا کہ اس نے اپنی عقل کے ذریعے اللہ جل شانہ کی معرفت حاصل کی تھی یا نہیں؟ اگر کی تھی تو اس کی نجات ہو جائے گی۔ بڑے بڑے سائنس دان اسی طریقے سے مسلمان ہوئے ہیں، انہوں نے دیکھا کہ یہ چیز اگر ہے تو یہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ جیسے قرآن پاک کے اندر ہے:

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾(النور: 40)

ترجمہ: "یا پھر ان (اعمال) کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں پھیلے ہوئے اندھیرے، کہ سمندر کو ایک موج نے ڈھانپ رکھا ہو، جس کے اوپر ایک اور موج ہو، اور اس کے اوپر بادل، غرض اوپر تلے اندھیرے ہی اندھیرے۔ اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جس شخص کو اللہ ہی نور عطا نہ کرے، اس کے نصیب میں کوئی نور نہیں۔"

سمندر کے اندر جانے والے ان کے سائنس دانوں نے جب یہ آیت سنی تو مسلمان ہو گئے۔ کہتے ہیں: محمد ﷺ نے کبھی سمندری سفر نہیں کیا اور یہ جتنی تفصیل بتائی گئی، یہ بغیر سمندر میں جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ محمد ﷺ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ ضرور یہ کسی اور کا کلام ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ نے کبھی بھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ چنانچہ بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی معرفت مظاہرِ قدرت کے ذریعے سے ہو سکتی ہے اور کرنی بھی چاہیے۔

متن:

جس کے قبضۂ قدرت میں یہ ساری کائنات محکوم و مجبور اور اسیر و پابند ہے۔ اصحاب طریقت معرفت کی راہ میں ہمیشہ اپنے آپ سے ابتدا کرتے ہیں اور اپنی فطرت سے ابتدا کرتے ہیں اور تمام کثیف و لطیف اور خشک و تر اشیاء اپنے نفس

سے طلب کرتے ہیں اور اپنے خالق و صانع خدا کی نشانیاں اور دلیل اپنے نفس میں پا لیتے ہیں ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (الزمر: 21)

ترجمہ: یقیناً ان باتوں میں ان لوگوں کے لئے بڑا سبق ہے جو یقین رکھتے ہیں۔"

اور بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ غور و فکر اور نظر کرنے کا کام حوالہ کرتا ہے تاکہ فکر و نظر کے بعد موجودات کے حالات کو دیکھ کر اس کو پہچان جائیں جیسا کہ فرمایا ہے ﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (یونس: 101)

ترجمہ: (اے پیغمبر) ان سے کہو کہ ذرا نظر دوڑاؤ کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا چیزیں ہیں؟"

اور بعض لوگوں کو مجاہدات و ریاضت کے راستے معرفت کی منزل تک پہنچایا جاتا ہے ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: 69)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے۔"

اور بعض کو پیغمبر کسی سبب اور وسیلہ کے اچانک ہدایت کا نور ان کے دل میں داخل کرتا ہے اور معرفت کا دروازہ ان کے لئے کھول دیا جاتا ہے۔

﴿ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (الزمر: 22)

ترجمہ: "جس کے نتیجے میں وہ اپنے پروردگار کی عطا کی ہوئی روشنی میں آچکا ہے۔"

اور بعض کو معرفت کی حقیقت سے بے نصیب اور محجوب رکھا جاتا ہے اور فرمایا کہ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الأنعام: 91) "اَیْ مَا عَرَفُوا اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهٖ"۔ اللہ کی قدر جیسا کہ اس کی قدرت اور حق ہے انہوں نے نہیں کی۔ یعنی جیسا کہ مناسب اور لازم ہے کہ اس کی معرفت کو نہ جان سکے اور بعض لوگوں کو مکمل اور حتمی طور پر اپنی معرفت سے محروم اور بے نصیب کیا گیا ہے اور فرمایا گیا کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرة: 7)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے"
تا کہ یہ لوگ اللہ کی معرفت حاصل نہ کر سکیں۔

تشریح:

قرآن و احادیث کو سمجھنے کے لئے اور عارفین کی باتیں سمجھنے کے لئے اپنی حفاظت کے نقطۂ نظر سے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک انسان صرف ایک چیز پر نظر رکھے اور باقی چیزوں سے صَرفِ نظر کر لے تو بعض دفعہ غلطی ہو جاتی ہے اور شیطان اس کو کسی اور طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرۃ: 7) اس آیت کو سن کر بعض کج فہم لوگ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے مہر لگا دی تو پھر ہمارا کیا قصور ہے؟ اس طرح وہ لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ طریقہ کار ایسا ہے جیسے ہمارے دل کے اندر دو چینل ہیں۔ ایک میں شیطان کی طرف سے الہام آتا ہے جس کو الہامِ شیطانی یا وسوسہ کہتے ہیں اور ایک میں اللہ کی طرف سے الہام آتا ہے جس کو الہامِ رحمانی کہتے ہیں۔ جو الہام ربانی سے متاثر ہو گیا اور الہام شیطانی کو چھوڑ دیا تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص کوئی نیکی کرتا ہے اس نیکی کا فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے دوسری نیکی آسان ہو جاتی ہے اور جو کوئی برائی کرتا ہے اس کی فوری سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کے لئے دوسری برائی آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے الہامِ رحمانی کی بات مان لی اور الہامِ شیطانی کی بات کو پیچھے دھکیل دیا تو دو کام ہو گئے، ایک اس نے اللہ کی بات مانی، یہ نیکی ہے اور دوسرا شیطان کی بات چھوڑی، یہ بھی نیکی ہے۔ معلوم ہوا اس کے لئے نیکی آسان ہو جائے گی کیونکہ اس کے لئے الہامِ رحمانی والا چینل کھل جائے گا اور الہامِ شیطانی والا چینل اس کے مقابلے میں کم ہو جائے گا۔ مثلاً پہلے اگر 50، 50 فیصد دونوں تھے تو یہ 51 فیصد ہو جائے گا اور وہ 49 فیصد ہو جائے گا۔ دوسری دفعہ ایسا عمل کیا کہ الہام رحمانی کی بات مانی اور الہام شیطانی چھوڑ دیا تو یہ 52 فیصد ہو جائے گا اور وہ 48 فیصد ہو جائے گا۔ تیسری دفعہ کیا 53 فیصد اور 47 فیصد ہو گیا۔

اسی طرح ہوتے ہوتے اللہ والا 100 فیصد ہو جائے گا اور شیطانی چینل صفر فیصد ہو جائے گا۔ اللہ پاک نے شیطان سے فرمایا تھا کہ جو میرے ہیں ان کو تو گمراہ نہیں کر سکتا۔ یہ سو فیصد والے ہیں، سو فیصد چونکہ اللہ کی طرف ہیں لہٰذا اللہ کے ہیں۔ شیطان کے نہیں ہیں لہٰذا شیطان ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ تو اگر کسی نے شیطانی الہام کی بات مانی اور رحمانی الہام کی بات چھوڑی تو یہ 51 فیصد ہو جائے گا اور وہ 49 فیصد ہو جائے گا، دوبارہ بات مانی تو 52 فیصد اور 48 فیصد ہو جائے گا۔ اس کے بعد 53 فیصد اور وہ 47 فیصد ہو جائے گا اور ہوتے ہوتے رحمانی چینل صفر فیصد ہو جائے گا اور شیطانی چینل سو فیصد ہو جائے گا۔ ان کے بارے میں اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ (البقرۃ: 7) آخری فیصلہ اللہ ہی کرتا ہے لیکن جس نے جیسا چاہا اللہ نے ویسا کر دیا۔ لیکن اس کے اپنے چاہنے سے ہوا نتیجتاً ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرۃ: 7) کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کو اختیار کرنا چاہا اور اس طرف چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں مجبور کر دیا گیا۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: 286)

ترجمہ: "اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔"

قرآن سب پہ لاگو ہے لہٰذا جو کوئی کر سکتا تھا اس سے کہا گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ حکم تو دے دیا اور کر نہ سکتا ہو۔ بلکہ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے عمل کروایا کہ کافروں نے بار بار یہ اعتراض کیا اور مطالبہ کیا کہ ہم پر فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ ہماری طرف بشر کو کیوں رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؟ اللہ جل شانہ کی طرف سے جواب آتا تھا کہ اگر یہ فرشتے ہوتے تو میں فرشتوں کو بھیجتا۔ چونکہ یہ انسان ہیں تو میں انسان کو ہی بھیجوں گا کیونکہ اگر فرشتہ آ جاتا تو ان کا اس سے بھی بڑا اعتراض یہ ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں ان کا تو نفس ہی نہیں ہے۔ اگر یہ گناہ نہیں کرتے تو ان کا کیا کمال ہے؟ ہم انسانوں کے ساتھ نفس لگا ہوا ہے لہٰذا ہم مجبور ہیں۔ اللہ جل شانہ نے ہمارے پاس بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا تاکہ کوئی اعتراض کا موقع نہ ہو۔

لیکن آپ ﷺ انسان ہونے کی وجہ سے بالکل ایسے ہی تکالیف اٹھاتے تھے جیسے کہ ہم اٹھاتے ہیں۔ مثلاً بھوک لگنا، پیاس لگنا، تھک جانا یہ ساری باتیں آپ ﷺ کے ساتھ بھی تھیں۔ بلکہ روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کو جو آخری تکلیف ہوئی تھی وہ عام لوگوں سے زیادہ تھی۔ اس تکلیف کی شدت کو دیکھ کر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنھا کی زبان سے بے اختیار نکلا: "ہائے میرے ابا جان کی یہ تکلیف"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آج کے بعد تیرے ابا جان کو کبھی تکلیف نہیں ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد پھر دوسری دنیا شروع ہو جائے گی جس میں آپ ﷺ کو تکلیف ہو ہی نہیں سکتی۔

اللہ جل شانہ کا نظام انتہائی انصاف پر مبنی ہے البتہ دینے والی اوسط زیادہ ہے۔ مثلاً کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کو دس گناہ اجر ملتا ہے اور کوئی بدی کرتا ہے تو اس کو اتنا ہی گناہ ملتا ہے۔ کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کا اجر فوراً لکھ دیا جاتا ہے اور جو بدی کرتا ہے تو اس کو موقع دیا جاتا ہے کہ عین ممکن ہے توبہ کر لے یا رجوع کر لے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: ﴿وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾(الشوریٰ: 30)

ترجمہ: "اور بہت سے کاموں سے تو وہ در گزر ہی کرتا ہے"

اس کو لکھتا ہی نہیں لیکن اگر کوئی آدمی مسلسل ہی خرابی کرتا جائے اور بگڑتا جائے اور زوری بھی کرتا جائے، ڈھیٹ پن دکھائے تو پھر اللہ پاک کسی سے مجبور نہیں۔ لہٰذا پھر جب اللہ پاک فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کے بعد بہت خطرناک صورتِ حال ہوتی ہے۔ اللہ جل شانہ نے اِس کا نقشہ سورۂ شمس میں یوں کھینچا ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا﴾ (الشمس: 11-13)

ترجمہ: "قوم ثمود نے اپنی سرکشی سے (پیغمبر کو) جھٹلایا۔ جب ان کا سب سے سنگدل شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ تو اللہ کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ: خبر دار! اللہ کی اونٹنی کا اور اس کے پانی پینے کا پورا خیال رکھنا۔"

اس نے اس اونٹنی کو جو معجزے کے ذریعے سے بر آمد ہوئی تھی کو مارنا چاہا

تو رسول نے اسے فوراً منع کر دیا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اس کو نہ مارو ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾ (الشمس: 14)

ترجمہ: "پھر بھی انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا، اور اس اونٹنی کو مار ڈالا نتیجہ یہ کہ ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر سب کو برابر کر دیا۔"

﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا﴾ (الشمس: 15)

ترجمہ: "اور اللہ کو اس کے کسی برے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

ایک آدمی دریا میں چھلانگ لگانا چاہتا ہے، اس کو بار بار جھٹکے لگتے ہیں کہ مت لگاؤ۔ لیکن ایک دفعہ وہ چھلانگ لگا ہی لے تو کہتے ہیں: اب جاؤ ہم کیا کریں۔ ایک آدمی چھلانگ لگا دے اور کہتا ہے یا اللہ مجھے بچا لینا، یہ بھی غلط ہے۔ مختلف حالات میں مختلف صورتِ حال ہوتی ہے کہ انسان اس طرح کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ فرعون نے بھی اخیر میں یہی کہا تھا: اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی۔ چنانچہ جو لوگ جانتے ہیں وہ تھر تھر کانپتے ہیں۔

متن:

چوں جمالش صد ہزاراں روے داشت
بود در ہر ذرہ دیدار دیگر
لا جرم ہر ذرہ را بنمود یار
از جمال خویش رخسار دیگر

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس انداز سے عبادت کرنا کہ گویا تم خدا کو دیکھ کر اس کی عبادت کرتے ہو اور اگر ایسا تم سے ممکن نہ ہو تو پھر ایسی عبادت کرنا کہ گویا وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

تشریح:

یہ کیفیتِ احسان ہے۔ حدیث میں آتا ہے: "أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ

تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ" (البخاری، حدیث نمبر: 50)

الجنان: جنان کیا ہے۔ "اَل جِنَانُ ھوَ ال قَل بُ الذِی یکو نُ المَع رِفَۃُ فِی ہِ" جنان وہ دل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو۔ "وَ ال قَل بُ وِعَاءٌ لَہٗ" اور معرفت کے لئے قلب یعنی دل ایک برتن ہے "وَ ھوَ ال مُشْتَقٌّ مِنَ ال جَنِی نِ" اور جنان کا لفظ جنین سے مشتق ہے۔ "وَ ال جَنِی نُ یکو نُ فِی الرَّحِمِ" اور جنین رحم میں ہوتا ہے۔ "**وَالرَّحِمُ فِي الْبَطَنِ**" اور رحم پیٹ میں ہوتا ہے۔ یعنی "**اَلْبَطَنُ وِعَاءُ الرَّحِمِ**" یعنی پیٹ رحم کا برتن اور ظرف ہے۔ "**وَالرَّحِمُ وِعَاءٌ لِّلْجِنَانِ**" اور رحم جنین یعنی بچہ کا برتن ہے۔ "**يُقَالُ لَهُ الْاِنْقِيَادُ**" اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے گردن رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور رزق پر راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ جو بیماری اور مصیبت نازل کرے اس پر صبر کرنا انقیاد کہلاتا ہے۔

شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ایمان، معرفت، توحید، شریعت اور دین کیا ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے اور معرفت اللہ تعالیٰ کی پہچان بغیر کسی کیفیت اور تشبیہ کے کرنا ہے اور توحید اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور وحدانیت کا ایسا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی ابتدا اور کسی انتہا کے ایک اور واحد ہے۔ اور شریعت اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اور اس کے ممنوعہ کاموں یعنی نواھی سے جان بچا کر رکھنا اور دین ان چار امور پر موت کے وقت تک قائم اور ثابت قدم رہنا ہے۔

تشریح:

یعنی جو جو بتایا گیا ہے اس سب کے اوپر موت تک قائم رہنا ہے۔

متن:

بغیر کسی تشبیہ سے کیا مراد ہے یعنی "**يَنْبَغِيْ لِلنَّاسِ اَنْ لَّا يُشَبِّهُوا اللهَ تَعَالٰى شَيْئًا مِنَ النُّوْرِ وَالظُّلْمَةِ وَالشَّجَرِ وَالْجَوَاهِرِ**" یعنی لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشابہت کسی چیز کے ساتھ نہ کریں، نہ نور سے، نہ ظلمت سے، نہ درخت اور

نہ جواہر وغیرہ سے۔

تشریح:

انسان جن چیزوں کو دیکھتا ہے ان کے بارے میں سوچتا ہے اور ان کے بارے میں خیال پیدا ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے اپنے گرجوں کے اندر فرشتوں کی اور پیغمبروں کی تصویریں بنائی ہوتی ہیں، بد بخت لوگ ہیں، بگڑ گئے ہیں۔ میں اس بات سے صرف ایک چیز ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اصل میں انسان نے فرشتے کو نہیں دیکھا۔ جنہوں نے دیکھا ہے وہ یہ کام نہیں کرتے، جو یہ کام کرتے ہیں وہ دیکھ نہیں سکتے۔ نتیجتاً وہ اپنے خیال میں جو کر سکتے ہیں کر لیتے ہیں۔ مثلاً براق آپ ﷺ کی سواری تھی تو اس کی خوبصورت تصویر اس طرح بنائی کہ اس کا چہرہ حسین عورت کا بنا دیا حالانکہ اس کا چہرہ ایسا نہیں تھا، لیکن انہوں نے سمجھا حسین بس یہی ہوتا ہے۔ یعنی جس چیز کو انہوں دیکھا ہے اسی کو حسین سمجھا۔ اور فرشتوں کو انسانی شکل کا بنایا ہوتا ہے اور ان کے پر بنائے ہوتے ہیں حالانکہ ان کے پر ایسے نہیں ہیں جیسے انہوں نے بنائے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے پر کو جتنا بھی تیز ہلائیں کیا اُتنی رفتار سے جایا جا سکتا ہے؟ جہاز کے پر بھی اس طرح کے نہیں۔ جہاز کے پر اگر اس طرح ہوتے جس طرح پرندوں کے پر ہیں تو جہاز کی رفتار بالکل اس طرح نہ ہوتی۔ چنانچہ جہاز سے بھی زیادہ رفتار والے فرشتوں کے پر کیسے ہوں گے؟ اسی طرح جنات کے پر بھی ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ پشتو میں کہتے ہیں "پیری ته غزني څه دي" یعنی جن کے لئے غزنی کیا چیز ہے وہ فوراً وہاں پہنچ جاتا ہے۔ تو جنات یا فرشتے یا دیگر مخلوقات چونکہ ہماری سوچ سے باہر ہیں کیونکہ ہم نے نہیں دیکھیں تو جو ہماری سوچ میں ہیں ہم ان پہ منطبق کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تو اللہ کی ذات کے بارے میں سوچنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی تنزیہ کرتا ہے اس کو کوئی نہ کوئی خیال جو آتا ہے وہ اس کا دیکھا ہوا ہوتا ہے۔ نور کو روشنی کی طرح سمجھتا ہے کیونکہ روشنی بھی دیکھی ہوئی ہے۔ تو اللہ کے بارے میں ان تمام چیزوں کی نفی کرنی ہوتی ہے کیونکہ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿لَنْ تَرٰنِي﴾ (الأعراف: 143)

ترجمہ: "تم مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکو گے۔"

اب سر کے بل الٹا بھی ہو جائے تو بھی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ تمہاری سوچ میں وہ چیز نہیں آ سکتی۔ اس لئے اللہ کے بارے میں فرمایا کہ جو بھی خیال آ جائے تو فوراً کہہ دو کہ اللہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ جل شانہ کو ہم ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ اللہ جل شانہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اس کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے جیسے فرمایا: "أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ" (البخاری، حدیث نمبر: 50) "تو ایسے عبادت کر جیسے تو خدا کو دیکھ رہا ہے"۔ یعنی نتیجہ ایسا ہونا چاہیے جیسے تو خدا کو دیکھ کر نتیجہ حاصل کرتا تھا۔ یعنی یہ Input ہے output based based نہیں ہے (یعنی نتیجے کے اعتبار سے ہے نہ کہ ابتدا کے اعتبار سے) یعنی اگر اللہ کو تو دیکھتا تو جیسے عبادت کرتا اس طرح عبادت کر۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم ذہن میں لا سکیں کہ اللہ پاک کو میں دیکھ رہا ہوں حالانکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ کی موجودگی ثابت ہے، اس موجودگی کے تصور کو اپنے اوپر اتنا طاری کر لو کہ ایسے ہو جیسے دیکھ رہے ہو۔ جیسے ہمارے بچوں کو بچپن میں ڈرایا جاتا ہے کہ "بھاؤ آ گیا"۔ یہ چیز بچوں کے ذہن میں اتنی راسخ ہو جاتی ہے کہ جب بھی اس طرح کہو وہ ڈر جاتا ہے۔ یعنی بھاؤ (خوفناک چیز) کی موجودگی کا احساس اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ بچہ اس سے ڈرتا ہے۔ اسی موجودگی کے احساس کو اپنے اوپر اتنا زیادہ مسلط کرنا چاہیے کہ آپ ایسے ہی کام کرنے لگیں جیسے اس وقت کرتے ہیں جب آپ کو کوئی دیکھ رہا ہو۔ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ (البقرۃ: 115)

ترجمہ: "لہٰذا جس طرف بھی تم رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے"۔

اب مثال کے طور پر میں قبلہ رخ بیٹھا ہوں، میں تصور کر سکوں کہ میں اللہ کے سامنے ہوں اور اگر مشرق کی طرف رخ کر لوں تو میں تصور نہ کر سکوں۔ قرآن میں اسی لئے فرمایا گیا کہ اس بات کو ختم کرو۔ البتہ نماز پڑھو گے تو قبلہ رخ ہو گے کیونکہ وہ حکم ہے۔ جیسے مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حکم ہے

اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سمت میں ہی ہے بلکہ مسجد حرم کی طرف چونکہ رخ کرنے کا حکم ہے لہٰذا ہم اس طرف رخ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ہر طرف ہے۔ لہٰذا میرا رخ جس طرف بھی ہو گا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اللہ پاک کی موجودگی اتنی کھل جائے کہ میں اس سے ایسے ہی اثر لوں جیسا اثر اس کے دیکھنے سے ہو گا۔ "**أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ**، اور دوسرا درجہ یہ ہے "**فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ**" اگر تو اس کو دیکھ نہیں پا رہا "**فَإِنَّهُ يَرَاكَ**" (البخاری، حدیث نمبر: 50) تو یہ یقینی بات ہے اور ایمان کا حصہ ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر میری دیکھنے کی صفت محدود ہے تو اس کی صفت محدود نہیں ہے بلکہ یقینی ہے، چنانچہ میں اگر نہیں دیکھ رہا تو اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس دوسری بات سے کوئی بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو اس کا استحضار نہ ہو۔ اس استحضار کو پیدا کرنا ہے۔ اگر کسی مسلمان سے بھی پوچھو گے جو کسی گہرے کام میں مشغول ہی کیوں نہ ہو کہ کیا اللہ تجھے دیکھ رہا ہے؟ وہ انکار نہیں کرے گا۔ البتہ اس کا استحضار بھی بہت ہونا چاہیے۔ جیسے ہمارے ایک دوست کی فیکٹری تھی، میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، ان کے سامنے ایک سکرین لگی ہوئی تھی۔ میں نے کہا: امجد صاحب آپ بھی ٹی وی دیکھتے ہیں؟ کہتے ہیں: یہ ٹی وی نہیں ہے بلکہ میں نے ورکشاپوں میں کیمرے لگائے ہوئے ہیں، میں جب اس کا نمبر سٹ (set) کرتا ہوں تو اس میں مجھے نظر آتا ہے کہ وہ لوگ کام کرہے ہیں یا نہیں؟ پھر اس نے تبدیل کر کر کے دکھایا کہ یہ فلاں ورکشاپ ہے اور یہ فلاں ورکشاپ ہے۔ پھر کہا: چونکہ وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ میرے پاس ایسا کیمرہ ہے تو بے شک میں نہ بھی دیکھ رہا ہوں لیکن وہ کام کر رہے ہوتے ہیں کہ شاید ہمیں دیکھا جا رہا ہے۔ آج کل سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں تو بعض لوگوں کو پتا نہیں ہوتا اور اس کے اندر ویڈیو محفوظ ہو جاتی ہے۔ بعد میں وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا تھا؟ ہمارے ساتھ تو ہر وقت کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿**وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا**﴾ (الکھف: 49)

ترجمہ: "اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے۔"

کہیں گے یا اللہ کیسی عجیب بات ہے نہ تجھ سے کوئی چھوٹی بات بچی ہے نہ کوئی بڑی بات بچی ہے۔ چنانچہ ہمارے اوپر ہر وقت کیمرے لگے ہوئے ہیں، یہ تو مستقبل کے لحاظ سے ہے۔ لیکن فوری طور پر اللہ تعالیٰ خود بھی ہمیں دیکھ رہے ہیں اور ہماری کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿**وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ**﴾ (الحدید: 4)

ترجمہ: "تم جہاں کہیں ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے۔"

اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور اس کے علم میں سب کچھ ہے۔ وہ ہمارے چہروں کو نہیں دیکھتا بلکہ ہمارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ ہم صرف چہروں کو دیکھتے ہیں دلوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا انتہائی مکروہ دشمن ایسا خوش نما چہرہ بنا سکتا ہے کہ ہم اس کو اپنا دوست سمجھیں گے۔ کیونکہ انسانوں کے اندر ایک کمزوری ہے کہ وہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں۔ تو تمام احتیاط کو اور تمام سوچ فکر کو بالائے طاق رکھ کر سمجھتا ہے کہ واقعی میں ایسا ہوں۔ عموماً ایسے لوگ جو آپ سے کوئی دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہوں بے شک آپ کے دشمن کیوں نہ ہوں وہ خوشامد کا سہارا لیتے ہیں۔ ہوشیار لوگ جو خوشامد کو پسند نہیں کرتے، حقیقت شناس ہوتے ہیں وہ اس خوشامد سے ہی ان کو پہچان لیتے ہیں کہ یہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے لئے کوئی داؤ بنایا ہے۔ لیکن بیچارے اخلاقی لحاظ سے کمزور لوگ جو اپنی خوشامد چاہتے ہیں ان کے لئے ایسے لوگ ہر قسم کی تدبیر بنا لیتے ہیں جو دھوکہ ہوتا ہے۔ بادشاہوں تک یہ بات جاتی ہے۔ بڑے بڑے عہدوں تک میں نے ایسی صورتِ حال بھی دیکھی ہے کہ جب کسی کا کسی کے ساتھ کوئی کام ہوتا ہے مثلاً کسی افسر کے ساتھ کام ہے تو اس افسر کو بعض دفعہ اپنے رشتے داروں کا پتا نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ میرا فلاں رشتہ ہے لیکن جس کو کام ہوتا ہے اس کو پتا ہو گا اور وہ تعلق بنا دے گا۔ وہ سارا گورکھ دھندا بنا لے گا اور آپ سے اپنا کام کروا لے گا۔ اس قسم کے عوام

کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں کو اس کی خاص مہارت حاصل ہوتی ہیں وہ کام نکالنے کے لئے ہر گُر جانتے ہیں، تعلق بنا سکتے ہیں، رخ بنا سکتے ہیں، خوشامد کر سکتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہمیں کمزور نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارے بڑے اللہ والے، صحابۂ کرام خوشامد سے ناراض ہوتے تھے کیونکہ اس سے انسان گمراہ ہوتا ہے۔

متن:

بغیر کسی تشبیہ سے کیا مراد ہے؟

یعنی لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشابہت کسی چیز کے ساتھ نہ کریں۔ نہ نور سے، نہ ظلمت سے، نہ درخت اور نہ جواہر وغیرہ سے۔

بلا تعطیل۔ یعنی "**لَا يَنْبَغِيْ لِلنَّاسِ اَنْ يَّعْلَمُوْهُ بِلَا شُغْلٍ كَمَا ظَنَّ الْيَهُوْدُ فِيْ يَوْمِ السَّبْتِ بَلْ هُوَ عَلٰى شُغْلٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾** (الرحمن:29) **وَقِيْلَ الْاِيْمَانُ هُوَ الْاِعْتِقَادُ بِالْقَلْبِ وَاِنَّمَا الْاِقْرَارُ شَرْطٌ لِاِجْرَاءِ اَحْكَامِ الْاِسْلَامِ بِلَا تَعْطِيْلٍ**" کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لئے یہ ہر گز مناسب نہیں کہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی شغل کے ہیں جس طرح یہود کہتے ہیں کہ وہ ہفتہ کے دن کچھ نہیں کرتا۔

تشریح:

یہود کے اندر ایک گڑبڑ تھی جو ہمارے لوگوں کے اندر بھی آ رہی ہے۔ ایک یہودی مسلمان ہوئے تھے انہوں نے ہمارے ایک ساتھی کو کہا: جتنے فرقے تمہارے اندر ہیں یہ وہی ہیں جو ہمارے اندر تھے۔ یہود کے اندر یہ گڑبڑ تھی کہ وہ پیغمبروں کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے تھے یعنی جب کوئی غلط کام کرتے وقت ان کا کوئی بڑا پھنس جاتا تو **نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ** جھٹ سے پناہ لیتا کہ فلاں پیغمبر نے بھی ایسا کیا ہے **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ**۔ جیسے آج کل کوئی ٹی وی دیکھ رہا ہو اور اس کو کہہ دیں کہ ٹی وی نہ دیکھو، کہتے ہیں: فلاں عالم بھی ٹی وی دیکھتے ہیں۔ اگر عالم دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو خراب کر رہا ہے تم اس کی وجہ سے اپنے آپ کو کیوں خراب کر

رہے ہو؟ اس عالم کے کرنے سے وہ کام جائز نہیں ہوتا البتہ وہ عالم خراب ہو جائے گا۔ لوگوں کو دیکھ کر اپنے لئے حکم تبدیل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہود نے پیغمبروں کے ساتھ اتنی فضول اور غلط چیزیں منسوب کی ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے کہ یہ کس دل گردے کے لوگ تھے؟ **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** تو نتیجہ بھگت گئے۔ یہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ کسی مسلمان کو کوئی "او یہودی" کہہ دے تو وہ بہت زیادہ غصہ ہو جائے گا جیسے کسی کو شیطان کہہ دیں تو غصہ ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ سب پیغمبروں کی اولاد ہیں لیکن اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ایسے ہو گئے کہ اب برائی کے نشان ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے وقت میں اپنے غلط عقیدے میں اتنے سخت تھے کہ کہتے تھے، جس کو اللہ پاک نے قرآن پاک میں نازل فرمایا: ﴿**وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ**﴾ (البقرۃ: 88)

ترجمہ: "اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں۔"

تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿**بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ**﴾ (البقرۃ: 88)

ترجمہ: "نہیں! بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے"

پیغمبروں کے ساتھ غلط باتیں وابستہ کرنے کے بعد آگے بڑھ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی انسانوں والی صفات وابستہ کیں۔ جیسے آرام کرنا، جو انسان کا کام ہے۔ مثال کے طور پر جو آٹھ گھنٹے آرام کر کے 16 گھنٹے کی زندگی چاق و چست بنا لے وہ عام آدمی ہے۔ جو چھ گھنٹے آرام کر کے ایسا کر سکے وہ زیادہ تگڑا ہے۔ جو چار گھنٹے آرام کر کے ایسا کر سکے وہ اس سے زیادہ تگڑا ہے۔ یہ تین گھنٹے والا اور زیادہ ہو گا۔ بھٹو صاحب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ تین گھنٹے آرام کرتے تھے اور تقریباً یہی بات ضیاء الحق صاحب کے بارے میں بھی تھی کہ وہ بھی بہت تھوڑا آرام کرتے تھے۔ یعنی رات کو دو دو بجے تک میٹنگ کی جاتی تھی پھر ضیاء الحق صاحب تہجد کے وقت اٹھے ہوتے تھے۔ یعنی مضبوط اعصاب کے لوگ تھے، یہی مضبوطی کی علامت ہے۔ جو دو گھنٹے آرام کرتے ہوں پھر وہ اور زیادہ، اور جو ایک گھنٹہ آرام کرے وہ اور زیادہ، جو آدھا گھنٹہ وہ ان سے بھی زیادہ اور جو بالکل نہ کرے وہ سب

سے زیادہ۔ تو اللہ جل شانہ کو آرام کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ جل شانہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج: 16)

ترجمہ: "جو کچھ ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے"

لہٰذا اس کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو آرام کی، کھانے پینے کی، شادی کی، کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ سب لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں، وہ جب بھی کسی کے ساتھ محبت کرتا ہے جذبات کی وجہ سے نہیں ارادے سے کرتا ہے۔ اور اگر کسی سے دشمنی کرتا ہے تو وہ بھی ارادے سے کرتا ہے۔ اللہ جل شانہ کی صفات انسانوں والی صفات نہیں ہیں۔ چونکہ ہمارے لوگوں میں بھی ان کے جراثیم آ چکے ہیں تو ایسا طبقہ موجود ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ وہ تجسیم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یعنی جسم کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ پاک کا ایسا ہی جسم ہے جیسا کہ ہمارا ہے۔ جس کا بھی یہ عقیدہ ہو تو باطل عقیدہ ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ تنزیہ اس کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی چیزوں سے پاک سمجھا جائے جو مخلوقات کی چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں یہ بات شامل ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی صفات ثابت نہ کریں جو مخلوقات کے لئے ہوں ورنہ ہم صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو حقیقی معرفت نصیب فرمائے۔

(بیان ختم ہونے کے بعد اجتماعی ذکر کی مجلس ہوئی جس کے بعد حضرت نے اجتماعی ذکر بالجھر کے بارے میں کچھ ارشادات فرمائے جو قارئین کے فائدہ کے لیے یہاں لکھ دیے گئے ہیں)

ذکر کے بارے میں آپ حضرات کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جتنا زور سے ہم نے یہ ذکر کیا اس زور سے آپ کوئی اور بات کر کے دیکھیں تو بری حالت ہو جائے گی، برداشت نہیں ہو گا۔ کیونکہ انسان کا جسم اتنی طاقت نہیں رکھتا۔ تقریباً روزہ افطار ہونے والا ہے لیکن آپ سب نے ما شاء اللہ

بہت زور کے ساتھ ذکر کیا تو آپ کو کمزوری محسوس نہیں ہوئی، یہ روحانی طاقت ہے۔ اور حق کا ذکر ہم نے کافی پُر زور کیا ہے۔ یہ بہت زور والا ذکر ہے۔ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سہروردیہ کا ذکر ہے اور حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب استغراق کی حالت میں ہوتے تھے تو ان کو استغراق سے نکالنے کے لئے ان کے خادم "**حق**" "**حق**" کہتے تھے تو ان کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے چل پڑتے پھر اس کے بعد "**حق**" "**حق**" کہتے تھے تو ان کو اپنی جگہ پہ لے آتے۔ وہ حضرات یہ ذکر ہزاروں کی تعداد میں کرتے تھے۔ چشتی حضرات اللہ کا ذکر ایک ہزار کی تعداد میں کرتے تھے۔ چوبیس ہزار مرتبہ اسم ذات کا ذکر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ بھی کراتے تھے۔ اگر آپ دل پر اس ذکر کو کریں، چاہے وہ "**لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه**" ہے، چاہے وہ "**ھو**" ہے، چاہے وہ "**حَق**" ہے آپ کو کچھ نہیں ہو گا لیکن جسم کے کسی اور حصے پر کر لیں تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ جس نے سیکھا نہ ہو تو وہ دل پہ نہیں کر پاتا۔ غالباً چند دفعہ آپ حضرات نے ہمارے ساتھ ذکر کیا۔ اللہ کا شکر ہے آپ اس طرح ذکر کرنے لگے جس طرح کرنا چاہیے۔ لیکن اگر یہ ذکر گردن پہ آ جائے تو انسان پاگل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اعصاب کے لحاظ سے یہ جسم کا بڑا نازک حصہ ہے جو متاثر ہو جاتا ہے اور خشکی ہو جاتی ہے۔ جو لوگ بیچارے خراب ہو جاتے ہیں وہ صحیح طور سے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ایک جگہ میں ذکر کرانے کے لئے گیا تھا۔ اوپر والی منزل پہ ہم تھے، نیچے کچھ اور لوگ ذکر کر رہے تھے۔ وہ صحیح طور پہ ذکر نہیں کر رہے تھے۔ میں نے وہاں کے لوگوں سے کہا کہ ان سے کہو ذکر نہ کرو اور اگر کرنا ہے تو پھر سیکھ کے کرو ورنہ نقصان ہو جائے گا۔

میرے پاس ایک دفعہ رات کو گیارہ بجے ہمارا ایک پڑوسی آیا سردیوں کی راتیں تھیں۔ کہا: میرے بیٹے کو جھٹکے لگ رہے ہیں آپ مہربانی کر کے آ جائیں۔ ان کا تعلق ایسے لوگوں سے تھا جو ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔ میں نے گھر والوں کو اطلاع کر دی کہ میں فلاں کے گھر جا رہا ہوں، کوئی اور مسئلہ نہ ہو جائے، اس لیے آپ کو

بس معلوم ہونا چاہیے۔ ان کی مسجد بھی تھی مسجد کا متولی لڑکے کا دادا تھا اور والد میرے پاس آیا تھا۔ بچہ تقریباً 20 سال کے لگ بھگ تھا جس کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: یہ کس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے؟ انہوں نے بتایا: سبز پگڑی والوں کے ساتھ۔ میں نے کہا: یہ ان شاء اللہ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا لیکن میں اس کا علاج اس شرط پر کروں گا کہ یہ پھر ان کے ساتھ نہیں اٹھے بیٹھے گا کیونکہ ان کو ذکر کا طریقہ نہیں آتا ہے، ان کی ضرب گردن پہ لگتی ہے جس سے یہ مسائل ہوتے ہیں۔ اگر آپ وعدہ کرتے ہیں تو میں اس کا علاج کرتا ہوں۔ اس کے والد نے خود ہی کہا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ نہیں اٹھنے بیٹھنے دیں گے۔ پھر میں نے اس کا علاج شروع کر دیا اور دو تین دن میں اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک ہو گیا، پھر بیعت بھی ہو گیا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ شوقیہ کر لیا بلکہ یہ علاج ہے۔ دوائیوں کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں کیونکہ جن کو طریقہ نہیں آتا وہ نقصان کر لیتے ہیں۔

ہمارے ساتھی ڈاکٹر کے بیٹے نے calpol کی پوری بوتل پی لی تھی۔ اس کا "ایل ٹی" لیول دو سو تک پہنچ گیا۔ مقصد یہ ہے کہ بچے بچے ہوتے ہیں ان کو کیا پتا۔ چنانچہ جتنا ذکر بتایا جائے اتنا کریں اس سے آگے پیچھے نہ کریں۔ قادری سلسلے کے ایک بزرگ تھے جو اپنے مریدوں کو کہتے تھے: میں نے جو آپ کو ذکر بتایا اس سے نہ ایک کم ہو نہ ایک زیادہ۔ اگر کر لیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ ذکر دوائی کی طرح ہے، طریقہ بھی بتایا جائے گا اور تعداد بھی۔

مجھے پنجابیوں سے گلہ ہے ابھی تک کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو سلطان باہوؒ کا کلام صحیح پڑھے۔ ڈوموں نے پڑھا ہے صحیح لوگوں نے نہیں پڑھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ **"ھو"** صحیح پڑھ ہی نہیں سکتے۔ منہ سے نکالتے ہیں حالانکہ منہ سے نہیں دل سے ہے۔ جو دل سے ھو نہیں نکال سکتا وہ سلطان باھوؒ والا ھو نہیں ہے۔ چنانچہ ذکر کے طریقے سیکھنے چاہئیں۔ ذکر کی مجالس میں الحمد للہ انسان بہت جلدی سیکھ لیتا ہے۔ جیسے قاری حضرات قرآن پاک کے مخارج سکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: آخ

تو سارے بچے آخ کہتے ہیں، عق تو سب بچے عق کہتے ہیں۔ سب کو علیحدہ علیحدہ نہیں سکھانا پڑتا بلکہ سارے بچے ایک ہی وقت میں سیکھ لیتے ہیں۔ تو اجتماعی ذکر اسی تعلیم کے لئے ہے کہ سارے ایک ہی وقت میں سیکھیں۔ اس پہ بعض لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اجتماعی ذکر کہاں سے ثابت ہے؟ میں ان کو کہتا ہوں کہ انفرادی ذکر جہاں سے ثابت ہےاجتماعی بھی ادھر سے ہی ثابت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ، اِلَّا اللہ، اللہُ اللہ** اس طرح کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے بلکہ یہ تعلیمی ذکر ہے، اصلاحی ذکر ہے۔ اگر وہ ثابت ہے تو ساتھ یہ بھی تعلیمی طور پہ ثابت ہے۔ بہر حال اگر آپ یہاں ذکر کریں گے تو پھر آپ کو صرف تعداد بتائی جائے گی جو آپ کے حال کے مطابق ہو گی۔ باقی طریقہ چونکہ آپ سیکھ چکے ہوں گے لہٰذا جہاں پر بھی ہوں گے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مختصرات سلوک

سلوک کا مجاہدہ

سلوک میں مقامات طے کرنے کے دوران مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ نفس نے روح کو باندھا ہوا ہوتا ہے، روح نفس سے خود بخود آزاد نہیں ہوسکتی۔ الا ماشاء اللہ۔

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کافی مشہور ہے۔ ان کے واقعہ میں جس مجاہدہ کا ذکر ہے وہ جسمانی مجاہدہ تھا۔

مجاہدے کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم نفسیاتی مجاہدہ ہے، یہ جسمانی مجاہدے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ آپ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھے، ایک مرتبہ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اُن کو "**فُصُوْصُ الْحِکَمْ**" کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو نسخہ تھا وہ پرانا تھا۔ خواجہ صاحب کی زبان سے نکلا کہ حضرت میرے پاس ایک نیا نسخہ آیا ہے کیا میں وہ نسخہ لے آؤں؟ یہ جو آپ کے پاس ہے یہ پرانا ہو چکا ہے۔ حضرت نے ذرا بے دھیانی سے فرما دیا کہ ہاں آپ کا نسخہ تو اچھا ہی ہوتا ہے۔ بس اتنا فرما کر آگے درس جاری رکھا۔ حضرت کے صاحبزادے چونکہ مزاج شناس تھے وہ سمجھ گئے کہ حضرت کو یہ بات نا گوار گزری ہے۔ انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب! کچھ پتا چلا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ صاحبزادے نے انہیں بتایا کہ در اصل یہ حضرت کی طرف سے نا گواری کا اظہار ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کو احساس ہو گیا، ان کو بات سمجھ آ گئی، چنانچہ انہوں نے فوراً معافی مانگ لی۔ مگر کام نہیں ہوا۔ خواجہ صاحب نے دوبارہ معافی مانگی، پھر بھی کام نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ رونا شروع کر دیا، پھر بھی کام نہیں ہوا۔ بالآخر اُن کے جوتے سر پر رکھ کر رونا شروع کیا، معافیاں مانگیں، مگر پھر بھی کام نہیں ہوا۔ جب بہت زیادہ رو چکے اور خوار و خجل ہو گئے تو صاحبزادے نے سفارش کی کہ حضرت میرے

خیال میں اب اِن کو معاف کر دینا چاہیے۔ تب کہیں معافی ملی اور حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے صاحبزادے کی سفارش پر معاف کر دیا۔ ساتھ ہی خواجہ صاحب کو اجازت بھی دے دی اور فرمایا یہ آپ کی تکمیل کے لئے تھا۔

مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میرے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے باتوں ہی باتوں میں میری اتنی دھنائی ہوئی کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مجھ سے تو یہ کیڑے بھی اچھے ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد حضرت کے خادم نے آ کر کہا کہ حضرت آپ کو بلا رہے ہیں۔ یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی کہ اب پتا نہیں کیا ہو گا۔ میں ڈرتے ڈرتے حضرت کے پاس گیا تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے اپنے مشائخ سے جو امانت پہنچی ہے میں اللہ پر توکل کر کے آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے پیروں سے جان نکل گئی کہ یا وہ حالت تھی یا اب یہ حالت ہے۔

در اصل یہ دونوں حضرات اپنے مریدوں سے نفسیاتی مجاہدہ کروا رہے تھے۔ ہر ایک کا مجاہدہ ایک جیسا نہیں ہوتا بلکہ جس کو آپ مجاہدہ سمجھتے ہوں وہ مجاہدہ ہی شمار نہیں ہوتا۔ ہمارے مشائخ نے اِس قسم کی چیزیں بہت ایجاد کی ہوئی ہیں۔ مجاہدے کے بہت سارے طریقے ہیں جن کے ذریعے مشائخ سلوک طے کرا دیتے ہیں۔ اِس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیے، نہ اِس پر زیادہ بحث کرنی چاہیے، یہ ہمارا میدان نہیں ہے، یہ شیخ کی صواب دید پر منحصر ہے۔ البتہ سلوک طے کرنا ہر حال میں لازم ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کا سلوک طے کرا دے۔ آمین۔

سلاسل تصوف:

جیسے جسمانی صحت مختلف طریقوں مثلاً یونانی حِکمت، ایلو پیتھی، ہومیو پیتھی اور آکو پنکچر وغیرہ سے حاصل ہو سکتی ہے، جو اس ایک مقصد کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان کے اصولوں میں کافی فرق ہونے کے با وجود سب سے صحت کا حاصل ہونا تجربے سے ثابت ہے اور یہ بات فضول ہے کہ کسی کو اگر ایک طریقے سے صحت حاصل ہو جائے تو وہ یہ کہنے لگے کہ باقی طریقے ناقص ہیں۔ کیونکہ عین

اسی وقت بعض دوسرے مریضوں کو اسی قسم کا فائدہ علاج کے دوسرے طریقوں سے ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے طریقے کے سوا باقی طریقے غلط ہیں تو ان کی یہ بات غلط ہو گی۔

اسی طرح روحانی صحت کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے **مُرَوَّج** ہیں جن میں سے پاک و ہند میں چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور طریقے بھی ہیں۔ یہ سب ایک جیسے مفید ہیں لیکن کسی کو ایک طریقے سے مناسبت ہوتی ہے اور کسی کو دوسرے طریقے سے۔

نقشبندی سلسلے کے بعض حضرات جو یہ بات کرتے ہیں کہ "جہاں دوسروں کی انتہاء ہے وہاں سے ہماری ابتدا ہے"، یہ غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ اس سلسلے کی ابتدا اگر دوسروں کی انتہاء کے برابر ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ دوسرے سلاسل کے اکابر سے بھی آگے ہونے کا دعویٰ کررہے ہیں جو کہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اس بات یعنی "جہاں دوسروں کی انتہاء ہے وہاں سے ہماری ابتدا ہے" کا صرف یہ مطلب ہے کہ نقشبندی حضرات ابتدا جذب سے کرتے ہیں اس کے بعد ان کو سلوک طے کرنا ہوتا ہے، جب کہ دوسرے سلاسل میں جذب بعد میں ملتا ہے اور سلوک پہلے طے کرایا جاتا ہے لیکن ان کا جذب جذبِ وہبی ہوتا ہے اور جو پہلے حاصل کرتے ہیں وہ جذبِ کسبی ہے۔ جذبِ کسبی صورتاً تو جذبِ وہبی کی طرح ہے لیکن بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس میں اور جذبِ وہبی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کے شب و روز

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کے شب و روز

الحمد للہ خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کے دروس و خطبات کا سلسلہ نہایت پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے جس سے طالبانِ حق مسلسل سیراب ہو رہے ہیں۔ دروس کی تفصیل درج ذیل ہے:

روزانہ کے بیانات اور معمولات

1۔ "درسِ قرآن پاک"

2۔ "مطالعہ سیرت بصورتِ سوال"

3۔ درس "ریاض الصالحین"

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں روزانہ فجر کی نماز کے بعد حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کی طرف سے قرآن پاک کا درس دیا جاتا ہے، اس کے متصل بعد مطالعہ سیرت بصورت سوال کے عنوان سے سیرت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور اسکے بعد ریاض الصالحین سے ایک حدیث شریف کی تعلیم ہوتی ہے۔

3۔ ٹیلی فون پر بات:

روزانہ 2 سے 3 بجے تک کا وقت (سوائے جمعہ کے) حضرت شاہ صاحب دامت برکاتہم سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے مختص ہے۔

ہفتہ وار ہونے والے بیانات و معمولات

جمعہ:

ہر جمعہ حضرت شاہ صاحب کسی ایک مسجد میں جمعہ کا خطاب فرماتے ہیں۔

بعد نمازِ عصر ختم قرآن، مجلس درود شریف اور اس کے بعد جمعہ کی آخری گھڑیوں میں دعا کی جاتی ہے جو کہ آن لائن نشر بھی کی جاتی ہے۔

ہفتہ:

ہر ہفتہ کے دن نمازِ عصر کے بعد سے اتوار کی صبح اشراق کی نماز تک مرد حضرات کے لئے اصلاحی جوڑ ہوتا ہے جس میں درج ذیل معمولات کیے جاتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد انفرادی ذکر۔

بعد نمازِ مغرب حضرت مولانا اشرف سلیمانی صاحب ؒ کی کتاب "سلوکِ سلیمانی" اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی کتاب "تربیت السالک" کا درس، اس کے بعد اجتماعی ذکر و دعا۔

بعد نماز عشاء ختمِ خواجگان، درود شریف کی مجلس۔

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحہ صاحب ؒ کی کتاب "اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ" سے تعلیم، کھانے پینے اور سونے کے آداب کا مذاکرہ۔

اتوار:

11 سے 12 بجے تک خواتین کے لیے خانقاہ میں شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ اصلاحی بیان۔

بچوں کا تربیتی پروگرام:

آج کے اس دورِ پر فتن میں جہاں مسلمانوں کو بہت سے مصائب کا سامنا ہے وہاں ایک بہت بڑا چیلنج اپنے بچوں کی اچھی ظاہری اور باطنی تربیت بھی ہے۔ آج ہمارے بچے انٹرنیٹ، موبائل اور سوشل میڈیا کی گندی ثقافتی یلغار کی زد میں ہیں اور اعمال کے ساتھ ساتھ اب ایمان بچانا بھی مشکل نظر آتا ہے۔

موجودہ دور کے چیلنجز اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بچوں کی بہترین ظاہری اور باطنی تربیت کے لیے خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کی جانب سے ہفتہ وار آن لائن تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا ہے۔ ہر اتوار کو اس کے لیے زوم کا استعمال کرتے ہوئے لائیو کلاس منعقد کی جاتی ہے جو کہ بعد میں تربیتی پروگرام کے یوٹیوب چینل پر بھی اپلوڈ کر دی جاتی ہے۔

اس تربیتی پروگرام کو تین سیشنز میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا سیشن 1 سے 9 سال کے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس میں دلچسپ کہانیوں

کے ذریعے بچوں میں بہترین دینی اور دنیاوی اقدار و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ ارکان اسلام کے بنیادی مسائل سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔

دوسرا سیشن 10 سے 14 سال کے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس میں بچوں میں اچھی عادات اور ذکر و تسبیحات کی تلقین کے ساتھ ساتھ قصص الانبیاء میں سے کچھ واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے مفید اسباق بتائے جاتے ہیں۔

تیسرا سیشن 15 سال اور اس سے بڑے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس کے اندر بچوں میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو قرب الٰہی حاصل کرنے کے طریقے اور مواقع بھی سکھائے اور بتائے جاتے ہیں اور آج کے دور کے تازہ فتنوں کے بارے میں آگاہی اور ان سے بچنے کی تربیت بھی کرائی جاتی ہے۔

جو خواتین و حضرات اپنے بچوں کی بہترین دینی اور دنیاوی تربیت کے خواہاں ہیں اور اس تربیتی پروگرام میں اپنے بچوں کو شامل کرانا چاہتے ہیں وہ مندرجہ ذیل وٹس ایپ گروپ میں شامل ہو جائیں۔ اس گروپ میں ان کو کلاس کا لنک اور تفصیلات بتا دی جائیں گی۔

گروپ میں شامل ہونے کے کیے اس نمبر پر بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے

گوہر انوار صاحب

03335383171

وٹس ایپ گروپ کا لنک:

https://chat.whatsapp.com/J3mkYpSOK9S72QxvGsYAG2

بعد نمازِ مغرب فرض عین علم کی تعلیم۔

رات آٹھ بجے انگریزی میں بیان۔

پیر:

بعد نمازِ عصر پشتو میں بیان، بعد نمازِ مغرب اپنی اصلاح و تربیت کے متعلق (بذریعہ واٹس ایپ، ای میل اور ٹیلی فون پر موصول ہونے والے) سوالات کے جوابات۔

منگل:

بعد نمازِ مغرب درس مثنوی شریف۔

بدھ:

بعد نمازِ مغرب درس مکتوبات شریفہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ۔

جمعرات:

بعد نمازِ مغرب علامہ شبلی نعمانی اور حضرت سید سلیمان ندوی رحمہا اللہ کی کتاب "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کا درس اور درود شریف کی مجلس۔

ماہانہ بنیادوں پر ہونے والے بیانات و معمولات:

ہر مہینے میں ایک اتوار کو خواتین کے لیے شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ دن 9 سے 12 تک اصلاحی جوڑ۔

مہینے میں ایک بار ہفتہ کے دن عصر سے اتوار عصر تک خانقاہ امدادیہ جہانگیرہ (صوابی) میں اصلاحی جوڑ۔

ہر مہینے کے پہلے جمعہ کو راولپنڈی اسلام آباد میں کاکاخیل حضرات کے لیے مغرب تا عشاء جوڑ ہوتا ہے جس میں کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا کتاب "مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ" سے درس ہوتا ہے۔

ہر مہینے میں ایک دفعہ رفاہ یونیورسٹی میں بیان ہوتا ہے جو آن لائن نشر بھی کیا جاتا ہے۔

5۔ 05 نومبر بروز ہفتہ جامع مسجد نبی آخر الزماں متصل ادارۃ تجوید القرآن مروہ ٹاؤن اسلام آباد میں عظمتِ قرآن و دستار فضیلت کے موقع پر حضرت والا کا بیان ہوا۔

18 نومبر بروز جمعہ زیارت کاکا صاحب میں جمعہ کی نماز سے اجلاس منعقد ہوا جس میں حضرت والا نے جمعہ کا بیان فرمایا اور اس کے بعد جہانگیرہ تشریف لائے جہاں جمعہ کی نمازِ عصر سے لیکر اتوار کی اشراق تک اصلاحی جوڑ ہوا۔

بزرگوں کی تحریریں کیوں پڑھنی چاہئیں؟

بزرگوں کی تحریریں اُن کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ ہم ہزاروں تجربات کرکے جس چیز تک نہیں پہنچ سکتے ان کی تحریروں سے ہم اُن چیزوں تک آناً فاناً پہنچ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے بزرگوں کی ان تحریروں میں ریسرچ کرنا جس سے ہمارا یہ مقصد حاصل ہوتا ہو بہت مفید ہے۔ پھر ان میں مجددین حضرات کا رنگ بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ مجددین حضرات کی تحقیقات عمومی دین کے لئے ہوتی ہیں جو کہ اس وقت کے لوگوں کی سطح کے مطابق پیدا شدہ فروگزاشتوں کو دور کرکے دین کو اصلی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

اگر صرف ایک آخری مجدد کی اتباع کی جائے تو وہ بھی کافی ہوتی ہے لیکن اگر چند متواتر مجددین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے حالات کے مطابق مطلوبہ تبدیلی لانے کا فن آشکارہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس کے لئے "by the process of extrapolation" حل ڈھونڈنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے اپنے ان اکابر کے فیوضات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ قلب، عقل اور نفس کی اصلاح کے متعلق راہنمائی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی اعمال بہت اونچے تھے جو کہ قلبی واردات والے حضرات کی راہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقلی اعمال بہت زیادہ اونچے تھے۔ اس وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا فائدہ اُن لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جن کی عقلیں بہت آگے کا سوچتی ہیں۔ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صفائی نفس کے اعمال بہت اعلیٰ تھے اس وجہ سے حضرت کی تعلیمات نفس کی صفائی کے کاموں میں مشعلِ راہ ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات آج کل کے منطقی موشگافیوں کے جوابات کے لئے ماحول بنانے اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کی تعلیمات سے پورا پورا مستفید ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

051 5470582 0332 5289274

sshabirkakakhel@gmail.com,
sshabir@tazkia.org

حضرت شاہ صاحب مدظلہ کو سوالات بھیجنے کیلئے 0315 5195788

www.tazkia.org